مطالعۂ قرآن حکیم کا

منتخب نصاب (درسی)

نکات برائے درس و تدریس

حصہ ششم

مؤلف

حافظ انجینیر نوید احمد رحمۃ اللہ علیہ

شعبہ مطبوعات
انجمن خدام القرآن سندھ کراچی رجسٹرڈ

مرحوم و مغفور مؤسس انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی دیرینہ خواہش اور عمل کے عین مطابق، انجمن ہذا اپنی تمام تصنیفات، تالیفات اور خطابات (آڈیوز/ وڈیوز) کو طبع اور تیار کر کے چاہے قیمتاً یا مفت تقسیم کرنے کی مکمل اجازت دیتی ہے۔ اس ضمن میں ہمارا "محفوظ حقوق" کا کوئی تقاضا بھی نہیں۔ البتہ اجراء کنندہ ان تمام مواد کے نسخے/ نقل، اجراء سے قبل انجمن کو تحریری اطلاع کے ساتھ بھیجنے کا پابند ہوگا اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ یہ تبدیلی یعنی الفاظ، غلط اقتباس، سیاق و سباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے انجمن ہذا اور اس کے مولفین کی صحیح ترجمانی نہ ہوتی ہو اور اس سے ہماری عزت و شہرت پر حرف آئے، تو ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتے ہیں۔

نام کتاب	:	منتخب نصاب (درسی) حصّہ ششم
مؤلف	:	حافظ انجینیر نوید احمد رحمہ اللہ
ناشر	:	مطبوعات، انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی
		مرکزی دفتر: B-375 علامہ شبیر احمد عثمانیؒ روڈ
		بلاک 6، گلشن اقبال، کراچی
		فون: +92-21-34993436-7
ای میل	:	Publications@QuranAcademy.com
ویب سائٹ	:	www.QuranAcademy.com
طبع 01 تا 06	:	6200
طبع 07	:	جمادی الثانی 1444ھ دسمبر 2022ء
تعداد	:	1100
قیمت	:	=/ 490 روپے

ملک بھر میں قرآن اکیڈمیز و مراکز

Karachi:
Quran Academy Defence 021-35340022-4
Quran Academy Yaseenabad 021-36337361 - 36806561
Quran Academy Korangi 021-35074664
Quran Institute Gulistan-e-Johar 021-34030119

Hyderabad:
Quran Academy Qasimabad 022-2106187
Quran Institute latifabad 022-3860489

Sukkur:
Quran Markaz Sukkur 071-5807281

Quetta:
Quran Academy Quetta 081-2842969

Jhang:
Quran Academy Jhang 047-7630861 - 7630863

Faisalabad:
Quran Academy Faisalabad 041-2437618

Lahore:
Quran Academy Lahore 042-35869501-3

Multan:
Quran Academy Multan 061-6510451 - 6520451

Islamabad:
Quran Academy Islamabad 051-2605725

Gujranwala:
Quran Markaz Gujranwala 055-3891695 - 0334-4600937

Peshawar:
Quran Markaz Peshawar 091-2584824 - 2019541

Malakand:
Quran Markaz Temargara 0945-601337

Azad Kashmir:
Quran Markaz Muzaffarabad 0982-2447221

انتساب

اُن باہمت حضرات وخواتین کے نام

جو الفاظِ قرآنی

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (یونس 58:10)

پر یقین کی عملی مثال قائم کرتے ہوئے اور حدیثِ نبوی ﷺ

خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَه (بخاری)

کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دنیا کی عارضی لذتوں کے مقابلے میں

آخرت کی ابدی کامیابی کے حصول کے لیے

اپنی بہترین صلاحیتیں

قرآنِ کریم کے سیکھنے اور سکھانے کے لیے

وقف کر دیں۔

فہرست

1	مطالعۂ تعارف سورۃ الحدید	5
2	حصّہ اوّل: آیات 1 تا 6: ذات وصفاتِ باری تعالیٰ	8
3	حصّہ دوم: آیات 7 تا 11: دینِ اسلام کے تقاضے	28
4	حصّہ سوم: آیات 12 تا 15: دین کے تقاضے اور انجامِ آخرت	46
5	حصّہ چہارم: آیات 16 تا 19: قربِ الٰہی کے حصول کا راستہ	62
6	حصّہ پنجم: آیات 20 تا 24: حیاتِ دنیا اور اِس کے حوادث	74
7	حصّہ ششم: آیت 25: تمام رسولوں کا مشن- نظامِ عدل کا قیام	109
8	حصّہ ہفتم: آیات 26 تا 29: رہبانیت- دین کے تقاضوں سے فرار کی راہ	126

حوالہ جات

- ''مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب'' کتابی صورت میں جس میں منتخب نصاب میں شامل تمام مقامات کا متن اور ترجمہ موجود ہے۔
- ''مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب (مفصّل)'' دو جلدوں میں جس میں منتخب نصاب میں شامل تمام مقامات کا متن، ترجمہ اور تفسیر موجود ہے۔
- منتخب نصاب کے تمام مقامات کے مختصر لیکن جامع دروس پر مشتمل الہدیٰ سیریز کے 44 لیکچرز پر مشتمل MP3 سی ڈی۔
- منتخب نصاب کے تمام مقامات کے تفصیلی دروس پر مشتمل 12 ویڈیو DVDs / دو آڈیو MP3 سی ڈیز

تعارف سورۃ الحدید

منتخب نصاب کا حصّہ ششم قرآنِ حکیم کی ایک مکمل سورۃ یعنی سورۃ الحدید[57] کے تفصیلی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اِس سورۃ کے بارے میں قابلِ ذکر نکات حسبِ ذیل ہیں:

1. سورۃ الحدید[57] مکی- مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی دس مدنی سورتوں میں شامل ہے۔ اِن سورتوں میں حسبِ ذیل خصوصیات ہیں:

i. اِن میں سے اکثر سورتوں کا زمانۂ نزول مدنی دور کا نصف ثانی ہے۔ اِس دور میں امتِ مسلمہ کی تشکیل ہو چکی تھی اور ایک مسلم معاشرہ وجود میں آچکا تھا، لہٰذا اِن سورتوں میں خطاب صرف مسلمانوں سے ہے۔ کفار کا ذکر ضمنی طور پر ہے اور اُن میں سے خصوصاً اہلِ کتاب کا ذکر بطورِ عبرت کیا گیا ہے۔ اہلِ کتاب مسلمانوں سے قبل امت کے منصب پر فائز تھے لیکن اُن میں بعض ایسی اعتقادی اور عملی گمراہیاں آگئیں جن کی وجہ سے اللہ اُن سے ناراض ہو گیا۔ اِن سورتوں میں ہمیں دعوتِ غور و فکر دی جارہی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ یہ گمراہیاں کن کن راستوں سے آئیں اور پھر ہم اِن گمراہیوں سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں۔

ii. اِن سورتوں میں ملامت اور جھنجھوڑنے کا انداز بہت نمایاں ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کے جذبۂ عمل میں کچھ کمی واقع ہو رہی ہے جس پر متوجہ کیا جارہا ہے جیسے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ (الحدید[57]:8)

"اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایمان نہیں رکھتے اللہ پر جبکہ رسول تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر"۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید[57]:10)

"اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کی ہے"۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ لَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (الحدید[57]: 16)

"کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مومنوں کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد اور اُس حق کے لیے جو نازل ہو چکا ہے اور وہ اُن کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتابیں دی گئی تھیں، پھر اُن پر زمانہ طویل گزر گیا (غفلت میں) تو اُن کے دل سخت ہو گئے اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں"۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ (الممتحنة[60]: 1)

"مومنو! دوست نہ بناؤ میرے اور اپنے دشمنوں کو، تم اُن کی طرف محبت کے پیغام بھیجتے ہو جبکہ وہ کفر کر چکے ہیں اُس حق کا جو تمہارے پاس آ چکا ہے"۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الصف[61]: 2-3)

"مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے؟ اللہ اِس بات سے سخت بیزار ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرو نہیں"۔

جھنجھوڑنے کے اِس اسلوب کے ہم زیادہ مستحق ہیں اِس لیے کہ آج ہماری اکثریت کی عملی صورتِ حال اُس دور کے منافقین سے بھی زیادہ گئی گزری ہے۔

iii. اِن سورتوں میں اہم مضامینِ قرآن کے خلاصے بیان کیے گئے ہیں مثلاً ایمان کے موضوع پر تمام تعلیماتِ قرآنی کا خلاصہ سورۃ التغابن[64] میں ہے، نفاق کے موضوع پر تمام تعلیماتِ قرآنی کا خلاصہ سورۃ المنافقون[63] میں ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر تمام تعلیماتِ قرآنی کا خلاصہ سورۃ الصف[61] میں ہے وغیرہ وغیرہ۔

iv. اِن سورتوں میں سے پانچ کا آغاز تسبیح باری تعالیٰ سے ہوا ہے اور اِنہیں مسبحات کہا جاتا ہے۔ سورۃ الحدید[57]- سورۃ الحشر[59]- سورۃ الصف[61] کے آغاز میں ماضی کا صیغہ سَبَّحَ آیا

ہے اور سورۂ جمعہ – سورۃ التغابن[64] کے آغاز میں مضارع کا صیغہ یُسَبِّحُ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الحشر[59] اِس اعتبار سے منفرد ہے کہ اِس کی پہلی اور آخری آیت میں تسبیح کا بیان ہے۔ مذکورہ بالا خصوصیات کی وجہ سے مذکورہ بالا دس سورتوں میں سے چھ سورتیں منتخب نصاب میں شامل کی گئی ہیں۔ حصہ دوم میں سورۃ التغابن[64]، حصہ سوم میں سورۃ التحریم[66]، حصہ چہارم میں سورۃ الصف[61]، سورۃ الجمعۃ[62]، سورۃ المنافقون[63] اور حصہ ششم میں سورۃ الحدید[57] شامل ہے۔

2. سورۂ حدید اِن تمام سورتوں میں سب سے جامع سورۃ ہے کیونکہ یہ اُن تمام مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو بقیہ سورتوں میں الگ الگ زیر بحث آئے ہیں۔ اِس سورت کا موضوع ہے "دینِ اسلام کے تقاضے"۔ ہماری دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے قرآنِ حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ اس سورۂ مبارکہ میں جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

3. مضامین کے اعتبار سے سورۂ حدید کی آیات کا تجزیہ اِس طرح ہے:

- آیات 1 - 6: ذات وصفاتِ باری تعالیٰ
- آیات 7 - 11: دینِ اسلام کے تقاضے
- آیات 12 – 15: دین کے تقاضے اور انجامِ آخرت
- آیات 16 - 19: قربِ الٰہی کے حصول کا راستہ
- آیات 20 - 24: حیاتِ دنیا اور اِس کے حوادث
- آیت 25: تمام رسولوں کا مشن – نظامِ عدل کا قیام
- آیات 26 - 29: رہبانیت – دین کے تقاضوں سے فرار کی راہ

سورۃ الحدید اوّل: آیات 1 تا 6

ذات وصفاتِ باری تعالیٰ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ
يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ② هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ
هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى
الْعَرْشِ ؕ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ
فِيْهَا ؕ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ④ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ⑤ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ وَ
هُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑥

سورۂ حدید کی ابتدائی چھ آیات معرفتِ خداوندی کے حصول کے لیے ایک بہت بڑا خزانہ ہیں۔ اِن چھ آیات میں ذات وصفات باری تعالیٰ کا بیان اعلیٰ ترین علمی سطح پر وارد ہوا ہے۔ قرآنِ حکیم پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ یہ عوام کے لیے بھی ہدایت ہے اور بڑے سے بڑے مفکر، فلسفی اور دانشور کے لیے بھی۔ قرآنِ حکیم میں عوام الناس کی ہدایت کے لیے عام فہم انداز اختیار کیا جاتا ہے جبکہ ذہین اور صاحبِ فہم لوگوں (Intellectuals) کے لیے خفی اسلوب میں اشارات موجود ہیں جو اُن کی ذہنی رہنمائی کے لیے کفایت کرتے ہیں اور جن پر غور و فکر کے ذریعے وہ اپنی علمی و فکری الجھنوں کو رفع کر سکتے ہیں۔ عام فہم انداز میں توحید کا بیان قرآنِ حکیم میں بے شمار مقامات پر اور مختلف اسالیب سے ملتا ہے، لیکن اپنی بلند ترین سطح پر یہ مضمون اِن چھ آیاتِ مبارکہ میں زیر بحث آیا ہے۔

آیت 1:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ... پاکی بیان کی اللہ کی ہر اُس شے نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے ... وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

- یہ آیت سورت کی پر شکوہ تمہید ہے جو بیان کر رہی ہے کہ اے مسلمانو! ایک ایسا خالق تم سے مخاطب ہے جس کی تسبیح ارض و سما کی ہر شے کر رہی ہے۔ وہ پوری طرح سے غالب اور کمالِ حکمت والا ہے۔

- سَبَّحَ - یُسَبِّحُ کے لغوی معنی ہیں تیرانا یعنی کسی شے کو اُس کے اصل مقام پر برقرار رکھنا اور اصطلاحی معنی ہیں پاکی بیان کرنا۔ تسبیح باری تعالیٰ سے مراد اِس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ اللہ ہر کمی، ہر عیب، ہر نقص، ہر احتیاج اور ہر کمزوری سے پاک ہے۔ یہ شان صرف اللہ کی ہے لہٰذا تسبیح کے ذریعے ہم اللہ کے اُس مقام پر ہونے کا اقرار کرتے ہیں جہاں اُس کا کوئی ساجھی نہیں۔

- لفظ "مَا" کے استعمال سے "کل مکان (Space)" کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اِسی طرح ان مدنی سورتوں میں تین بار ماضی کا صیغہ سَبَّحَ (سورۂ حدید، سورۂ حشر، سورۂ صف کے آغاز میں) اور تین ہی بار مضارع کا صیغہ یُسَبِّحُ (سورۂ جمعہ و سورۂ تغابن کے آغاز اور سورۂ حشر کے آخر میں) استعمال کر کے "کل زمان (Time)" کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گویا ہر وقت اور ہر جگہ کائنات میں ہر شے اللہ کی تسبیح کرتی رہی ہے، کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔

- کائنات کی ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے سے مراد یہ ہے کہ جس شے پر بھی غور کیا جائے وہ اپنے وجود سے اپنے خالق کی صناعی و کاریگری کی خوبی و مہارت کا شاہکار نظر آتی ہے۔ مشرق سے ابھرتا ہوا سورج، چمکتے ہوئے چاند اور ستارے، وسیع و عریض آسمان و زمین، اونچے اونچے پہاڑ، برستی ہوئی بارشیں، ٹھاٹھیں مارتے سمندر، بہتے ہوئے دریا، چلتی ہوئی ٹھنڈی اور گرم ہوائیں، موسموں کے تغیر و تبدل، رات اور دن کا الٹ پھیر، لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، گھنے باغات، طرح طرح کے پرندے، حیوانات اور حشرات ایک عظیم خالق، باری اور مصور کی تصویر گری کا کمال پیش کر رہے ہیں۔ بقولِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ

مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

ہر شے اپنی ذات سے اللہ کے کمالات کا اظہار کر رہی ہے اور اپنے وجود سے اُس کے ہر نقص سے بری اور ہر عیب سے پاک ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ اِن مظاہر فطرت پر غور ہمارے لیے معرفتِ خداوندی کے حصول کا کیا خوب ذریعہ ہے!

- کائنات کی ہر شے زبانِ حال سے اپنے خالق کی صناعی اور کمالِ تخلیق کا اعلان تو کر ہی رہی ہے لیکن اُسے اللہ نے قوتِ گویائی بھی دی ہے جس سے وہ تسبیحِ حالی کے ساتھ ساتھ تسبیحِ قولی بھی کر رہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل 17:44)

"ساتوں آسمان اور زمین اور جو مخلوقات اِن میں ہیں، سب اُسی کی تسبیح کرتے ہیں اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اُس کے شکر کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔

- اِس آیت میں اللہ کی دو صفات عزیز اور حکیم بیان ہوئی ہیں۔ عزیز کی صفت اللہ تعالیٰ کے اختیارِ مطلق کو ظاہر کرتی ہے یعنی اللہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ وہ کل اختیار کا مالک ہے اور اُس کی مرضی کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اللہ کی یہ صفت قرآنِ حکیم میں اکثر صفتِ حکیم کے ساتھ آتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہمارا تصور یہ ہے کہ جہاں اختیار زیادہ ہوتا ہے وہاں اُس کے غیر عادلانہ استعمال کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ پولیٹکل سائنس میں یہ بات ایک اصول کی حیثیت سے مانی جاتی ہے کہ:

Authority tends to corrupt

and absolute authority corrupts absolutely.

اللہ کی صفتِ عزیز کے ساتھ صفتِ حکیم کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ اللہ اپنے اختیارات کو حکمت کے ساتھ استعمال فرماتا ہے اور کسی پر کوئی ظلم نہیں فرماتا۔ اِس ضمن میں یہ احتیاط البتہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یوں نہ کہا جائے کہ اُس کا اختیار حکمت کے تحت استعمال ہوتا ہے۔ اللہ جیسے اپنی

ذات میں مطلق ہے ویسے ہی اُس کی تمام صفات بھی مطلق ہیں۔ اُس کی کوئی صفت دوسری صفت کے تابع نہیں۔ اُس کا اختیار مطلق ہے اور اُس کی حکمت بھی مطلق ہے۔ لہٰذا "اختیارات کا استعمال حکمت کے ساتھ" کے الفاظ زیادہ صحیح اور محفوظ ہیں۔

آیت 2:

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ ... اُسی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں اور زمین کی ... يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ ... وہ زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے ... وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

- لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے الفاظ دو معنی ظاہر کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا حق اللہ ہی کو پہنچتا ہے اور دوسرے یہ کہ فی الواقع بھی یہاں اللہ ہی کی بادشاہی اور حکمرانی ہے۔ جدید اصطلاحات میں یوں کہیں گے کہ "De facto" بھی وہی بادشاہ ہے اور "De Jure" بھی اُسی کی بادشاہی ہے۔ اللہ ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہاں حکمرانی کرے۔ سورۃ الاعراف[7] آیت 54 میں فرمایا گیا کہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ... "تخلیق اُس کی ہے لہٰذا حکم بھی اُسی کا چلے گا"۔ کائنات اُس نے پیدا کی ہے چنانچہ اُسی کی مرضی اور اُسی کا اختیار یہاں جاری و ساری ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور کو بادشاہ یا حاکم ماننا ایک بہت بڑا شرک ہے۔ بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے، بقولِ اقبال:

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آزری!

پہلے اِس شرک کا ارتکاب ایک شخص فرعون کی صورت میں کرتا تھا جب وہ حاکمیت کا دعویٰ کرتا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى "میں ہوں تمہارا سب سے بڑا رب" (النازعات[79]: 24)۔ اب انسانی حاکمیت (Human sovereignty)، نظری طور پر عوامی حاکمیت (Popular sovereignty) میں تبدیل ہو چکی ہے۔ گویا وہ ٹنوں گندگی جو پہلے ایک شخص کے سر پر تھی، اب تولہ تولہ ماشہ ماشہ عام آدمی کو بھی پہنچا دی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کا مفہوم یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔

- اِس کائنات میں اصل اختیار تو اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اُس نے امتحان کے لیے ہمیں معمولی سا اختیار دے دیا ہے۔ ہمارا یہ اختیار نہایت محدود ہے کیونکہ ہمارے اپنے وجود پر بھی اکثر و بیشتر اللہ ہی کا حکم جاری و ساری ہے۔ ہمارے دل کی حرکت، ہمارے جسم میں خون کی گردش، ہمارے جسم پر بالوں کی افزائش وغیرہ ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ ہی کے قانون کے تابع ہے۔ اللہ نے انسان کو ایک ذرا سا اختیار دینے کے بعد آزادی دی کہ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (الدھر[76] :3) "چاہے وہ اللہ کا شکر گزار بن کر رہے اور چاہے ناشکری کی روش اختیار کرے"۔ یہ ہلدی کی وہ گانٹھ ہے کہ اِس کو لے کر اگر کوئی پنساری بن بیٹھے تو بن جائے لیکن روزِ قیامت یہ اختیار، اقتدار، فرعونیت اور قارونیت سب طشت از بام ہو جائے گی۔ معلوم ہو گا کہ وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ (العنکبوت[29] :64) "دنیا کی زندگی نہیں تھی مگر ایک ڈرامہ"۔ اِس ڈرامے میں مختلف لوگوں کو عارضی طور پر مختلف کردار دے دیے گئے تھے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ "وہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت دیتا ہے"۔ آیت کا یہ حصہ اُس گمراہی کا ازالہ کرتا ہے جس کا ذکر سورۃ الجاثیۃ[45] آیت 24 میں یوں کیا گیا کہ مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا "نہیں ہے کوئی زندگی سوائے اِس دنیا کی زندگی کے، ہم خود مرتے ہیں، خود جیتے ہیں"۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حیات و موت کا سلسلہ از خود نہیں چل رہا بلکہ یہ اللہ کے حکم کے تحت ہے۔ سورۃ آل عمران[3] آیت 145 میں فرمایا گیا وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا "کسی ذی نفس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مر جائے مگر اللہ کے حکم سے، اُس (موت) کا تو ایک معین وقت ہے لکھا ہوا"۔ یہ مادّہ پرستانہ نظریہ ہے کہ ہم خود سے زندہ ہیں اور ہم خود ہی مرتے ہیں جبکہ اللہ پر ایمان اور اُس کی معرفت کا مظہر یہ یقین ہے کہ اللہ ہی ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور وہی ہمیں موت دے گا۔ ہم اگر موت سے فرار اختیار کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے اور اگر خود سے مرنا چاہیں تو نہیں مر سکتے جب تک اللہ کا حکم نہ ہو۔

- آگے فرمایا وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ "اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ یہ الفاظ قرآنِ مجید میں کئی بار آئے ہیں۔ اِن الفاظ کے ذریعے اللہ نے کفار کے اِس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہم مر جائیں اور ہماری ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو کر چورا چورا ہو جائیں تو ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ اللہ ہر شے پر قادر ہے یعنی جب وہ نطفے سے مکمل انسان بنا سکتا ہے تو بوسیدہ ہڈیوں سے دوبارہ زندہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔

- عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں لفظ "کُل" اللہ تعالیٰ کی معرفت کے اعتبار سے ہمارے لیے پناہ گاہ ہے۔ جہاں تک اللہ کی معرفت کا معاملہ ہے تو ہم اللہ کی ذات کا ادراک تو کر ہی نہیں سکتے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں:

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الذَّاتِ اِدْرَاكُ

"اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا احساس ہی ادراک ہے"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اِس پر کیا خوب اضافہ فرمایا:

وَالْبَحْثُ عَنْ كُنْهِ الذَّاتِ اِشْرَاكُ

"اللہ کی ذات کے بارے میں کھوج کرید کرنا شرک ہے"

ہمیں اللہ کی معرفت صرف صفات کے حوالے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ البتہ اُس کی صفات کی بھی اصل کیفیت (Quality) اور کمیت (Quantity) ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ سمیع یعنی سننے والا ہے، لیکن وہ کیسے سنتا ہے؟ کتنا سمیع ہے؟ ہم نہیں جان سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ قدیر ہے، لیکن کتنا قادر ہے؟ اِس کا احاطہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ لفظ "کُل" ہمارے لیے عافیت کا ذریعہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ ہر شے کا علم رکھنے والا ہے، وہ ہر شے پر گواہ ہے، وہ ہر شے سے باخبر ہے اور وہ ہر شے کو دیکھنے والا ہے۔

آیت 3:

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ ... وہی ہے پہلا اور آخری اور ظاہر اور پوشیدہ... وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

- اِس آیت میں اللہ کی چار صفات بیان ہوئی ہیں۔ اَلْاَوَّلُ- "وہ ہستی جو سب سے پہلے ہو"۔ اَلْاٰخِرُ- "وہ ہستی جو سب سے آخر میں ہو"۔ اَلظَّاهِرُ- "وہ ہستی جو بالکل نمایاں ہو" یا "وہ ہستی جو غالب اور چھائی ہوئی ہو":

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از مہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا

اَلْبَاطِنُ- "وہ ہستی جو مخفی ہے اور جس کی حقیقت کو کوئی نہیں جان سکتا":

ردائے لالہ و گُل پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں، عجیب عالم ہے!

- سورۂ حدید کی یہ تیسری آیت قرآنِ حکیم کے مشکل ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ اِس آیت میں پہلی صفت اَلْاَوَّلُ بیان ہوئی ہے جو بظاہر دوسری صفت اَلْاٰخِرُ کی ضد ہے۔ اِسی طرح تیسری صفت اَلظَّاهِرُ ہے جو بظاہر چوتھی صفت اَلْبَاطِنُ کی ضد ہے۔ ویسے تو اللہ کی اور صفات بھی باہم متضاد ہیں جیسے وہ اَلْمُذِلُّ (ذلیل کر دینے والا) بھی ہے اور اَلْمُعِزُّ (عزت دینے والا) بھی۔ اِس طرح کی صفات کا بیک وقت ایک ذات میں ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن اِس آیت میں جو صفات بیان ہوئی ہیں اُن کا بیک وقت کسی ذات میں جمع ہونا ہمارے ناقص فہم میں آنا ناممکن ہے۔ پھر یہ آیت قرآنِ حکیم کا واحد مقام ہے جہاں اللہ کی صفات کے درمیان حرفِ عطف "و" آیا ہے۔ گویا حتمی انداز سے واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ بیک وقت اَلْاَوَّلُ بھی ہے اور اَلْاٰخِرُ بھی، اَلظَّاهِرُ بھی ہے اور اَلْبَاطِنُ بھی۔ اِسی لیے اِس آیت کے بارے میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے تاثرات یہ ہیں کہ:

اِعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِيْقٌ مُهِيْبٌ (۱)

"جان لو کہ یہ مقام بڑا مشکل، گہرا، لرزا دینے والا مقام ہے"۔

- ایک عام سطح کا ذہن رکھنے والے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس آیت کے فہم کو اپنی ایک مناجات میں اِن الفاظ کے ذریعے آسان فرما دیا:

(۱) تفسیر الرازی، سورۃ الحدید آیت ۳

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ، وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ، وَاَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ، وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ[1]

”اے اللہ! تو وہ پہلا ہے کہ تجھ سے پہلے کچھ نہیں تھا، تو وہ آخر ہے کہ جس کے بعد کچھ نہیں، تو وہ ظاہر اور غالب ہے کہ جس کے اوپر کچھ نہیں اور تو وہ مخفی ہے کہ تجھ سے پرے اور تجھ سے زیادہ مخفی اور کوئی نہیں“۔

- اِس آیت میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے اللہ کی معرفت کے حصول کا حکیمانہ نکتہ پوشیدہ ہے۔ اِس نکتے تک رسائی سے قبل یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ ایک عام آدمی کے لیے معرفتِ الٰہی کے حوالے سے اولاً یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ ہی اُس کا اور کائنات کی ہر شے کا خالق ہے۔ پھر اُس خالق کی صفاتِ کمال کا ایک اجمالی علم حاصل ہو جائے۔ اِس کے بعد معاملہ عمل کا ہے کہ اُسی کی اطاعت کرو، اُسی کے سامنے سر جھکاؤ، اُسی سے دُعا کرو اور اُسی سے محبت کرو۔ یہ معاملہ ہے ایک ایسے انسان کا جو عام عقلی سطح کا حامل ہے۔ البتہ جو لوگ غور و فکر کرنے والے ہوتے ہیں اور فطری طور پر ایک شدید علمی پیاس اُن کے اندر موجود ہوتی ہے، وہ خالق کے وجود اور مخلوق سے اُس کے تعلق کی نوعیت جاننے کے لیے خود کو بے چین پاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بے چینی دور کرنے کے لیے تسکین کا سامان بھی اِس آیت میں موجود ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم هُدًى لِلنَّاس ہے اور اِس میں ہر ذہنی سطح کے انسان کے لیے ہدایت موجود ہے۔

- خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کو علم الکلام کی اصطلاح میں ”ربط الحادث بالقدیم“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت تو سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ کائنات بغیر کسی پیدا کرنے والے کے وجود میں نہیں آئی۔ مشکل مسئلہ یہ ہے کہ خالق و مخلوق کا باہمی تعلق کیا ہے؟ آیا خالق و مخلوق کے مابین کوئی ثنویت یا دوئی ہے کہ خالق کو جدا سمجھا جائے اور مخلوق کو جدا یا یہ کہ اِن کے مابین کوئی اور تعلق ہے؟ پھر اگر کچھ اور تعلق ہے تو وہ کیا ہے؟

---

(1) صحیح مسلم، کتاب الذِّکرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَۃِ وَالاِسْتِغْفَارِ، باب مَا یَقُولُ عِنْدَ النَّوْمِ وَأَخْذِ الْمَضْجَعِ، عَنْ ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ

- خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کے حوالے سے پہلا فلسفیانہ تصور تو یہ پیش کیا گیا کہ جس طرح کسی بڑھئی نے لکڑی سے کرسی بنا دی، اِسی طرح خالق نے مادّے سے کائنات کی مختلف اشیاء بنادیں۔ یہ تصور خالق اور مادّے دونوں کو قدیم مانتا ہے یعنی خالق کے ساتھ ساتھ مادہ بھی شروع سے موجود تھا جس سے خالق نے یہ کائنات بنائی۔ اِس اعتبار سے یہ تصور ایک گمراہی ہے اور شرک کی ایک صورت ہے۔

- ایک دوسرا فلسفیانہ تصور یہ بیان کیا گیا کہ خالق و مخلوق کا باہمی تعلق اِسی نوعیت کا ہے جیسے برف پگھل کر پانی بن جائے۔ اب برف کو تلاش کرنا کہ وہ کہاں ہے، ایک بے معنی سی بات ہے۔ وہ برف اب کہیں نہیں ہے بلکہ یہ پانی ہی برف ہے۔ اِسی طرح خالق نے خود تحلیل ہو کر کائنات کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ نظریہ ہمہ اوست (Pantheism) کہلاتا ہے جو شرک فی الذات کی بدترین صورت ہے۔ اِس نظریہ کی رُو سے ہر شے الوہیت کی حامل بن جاتی ہے۔ ایک گمراہ کن نظریہ حلول و اتحاد کا بھی ہے کہ جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے اور شکر کا علیحدہ وجود ختم ہو جاتا ہے اِسی طرح خالق اِس کائنات میں یا کسی انسان میں حلول کر گیا ہے۔ یہ سب گمراہی کی صورتیں ہیں:

حلول و اتحاد ایں جا محال است
کہ در وحدت دوئی، عینِ ضلال است

- خالق و مخلوق کے تعلق کے ضمن میں یہ مختلف تصورات دنیا میں رہے ہیں۔ سوچنے والے بہرحال سوچنے پر مجبور تھے۔ یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ انہیں سوچنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ بات اُن لوگوں کے لیے تو صحیح ہے کہ جن کے ذہن میں وہ سوال پیدا ہی نہیں ہوا۔ جسے پیاس لگی ہی نہ ہو اس کا معاملہ مختلف ہو گا، لیکن جسے لگ گئی ہو اُسے تو اب پانی تلاش کرنا ہو گا۔ چنانچہ جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ مسائل کلبلا رہے ہوں، جو لوگ فلسفیانہ مزاج کے حامل ہوں اور جن کی افتادِ طبع یہ ہو کہ وہ ہر شے کی حقیقت کو جاننا چاہتے ہوں:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

وہ اِن مسائل پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور خود کو اِس معاملے میں بے بس پاتے ہیں۔ جن کے ذہن حقائق الاشیاء تک پہنچنے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں، وہ یہ جاننے کے لیے خود کو مجبور پاتے ہیں کہ خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے مابین تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

- خالق و مخلوق کے تعلق کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے بے چین لوگوں کے اطمینان کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے ذہنوں میں اُٹھنے والے سوالات کا جواب دیا جائے۔ جن مسلمان متکلمین نے ایسا کیا اُن میں سب سے پہلے نمایاں شخصیت شیخ محی الدین ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اِبنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے وجودِ باری تعالیٰ کو سمجھانے کے لیے فلسفۂ وحدت الوجود پیش کیا۔ اِس فلسفے کے مطابق وجودِ حقیقی صرف اللہ ہی کا ہے۔ اِس وجود نے جب تعین کی شکلیں اختیار کیں تو مختلف وجود ظہور میں آگئے اور اِن میں اور اُس وجودِ مطلق میں ایک اعتباری یا نسبت کے اعتبار سے مغائرت پیدا ہوگئی۔ یہ صرف تعینات کا پردہ ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے ماہیتِ وجود صرف ایک ہی ہے۔ یہ فلسفہ اِس قدر دقیق ہے اور اِس کی تعبیر کا معاملہ اتنا مشکل ہے کہ اِس کے لیے جو بھی الفاظ اختیار کیے جائیں وہ کچھ یوں تلوار کی دھار پر چلنے کی مانند ہیں کہ ذرا اِدھر ہوں تو معاملہ ہمہ اوست کا بن جاتا ہے۔ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے نظریات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمہ اوست کے نظریہ میں مخلوقات کے وجود کو حقیقی مانا جاتا ہے جبکہ وحدت الوجود کے فلسفہ میں حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کا تسلیم کیا جاتا ہے۔ صرف ظاہری طور پر صورت یہ ہے کہ ثنویت سامنے آتی ہے یعنی خالق اور ہے مخلوق اور ہے، عبد اور ہے معبود اور ہے۔

- شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے وحدت الشہود کا فلسفہ پیش کر کے فلسفۂ وحدت الوجود کو زیادہ محتاط اور عام فہم کر دیا اور خطرات سے بہت حد تک بچا دیا۔ اُنہوں نے خالق و مخلوق کے ربط کو یوں بیان کیا کہ وجود تو در حقیقت ہے صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا۔ مخلوقات، اِس وجودِ حقیقی کا سایہ یا عکس ہیں اور سائے یا عکس کا کوئی مستقل وجود نہیں ہوتا:

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ أَوْ خِيَال

أَوْ عُكُوسٌ فِي الْمَرَايَا أَوْ ظِلَال

جو کچھ جہان میں ہے وہ کوئی وہم یا خیال ہے
یا کسی آئینے میں عکس ہے یا سایہ ہے

غالب نے اِسی تصور کو یوں بیان کیا:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے!

فلسفۂ وحدت الشہود کو سمجھانے کے لیے شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہترین تشبیہ اختیار کی کہ ایک لکڑی کے سرے پر کپڑا باندھ کر اُس میں تیل ڈال کر آگ لگا دی جائے۔ ایک شعلۂ جوالہ وجود میں آجائے گا۔ اب اگر اِس لکڑی کو تیزی کے ساتھ دائرے میں حرکت دی جائے تو ایک آتشی دائرہ نظر آئے گا۔ دائرہ نظر آرہا ہے، محسوس ہو رہا ہے، مشہود ہے لیکن فی الواقع موجود نہیں:

لو شمعِ حقیقت کی، اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی حرکت سے، کیا کیا نظر آتا ہے

یہ ہے مثال اِس کائنات کی، اِس سلسلۂ موجودات اور کون و مکاں کی۔ کائنات اور اس میں بے شمار مخلوقات نظر آتی ہیں، محسوس ہوتی ہیں، مشہود ہیں لیکن اِن کا وجود نہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ایں از صنعتِ باری تعالیٰ است
کہ معدوم را موجود می نمایند

"یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اُس نے معدوم کو موجود کر کے دکھایا"۔

- لوگوں کو مغالطہ ہے کہ شاید شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفۂ وحدت الوجود کو گمراہی سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے اختلاف کیا ہے لیکن اپنے مکتوبات میں ایک جگہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

"میں اُس کے دستر خوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والوں میں سے ہوں"۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مشہور مکتوب مدنی میں تحریر فرمایا ہے کہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفۂ وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفۂ وحدت الشہود میں صرف ایک تعبیر کا فرق ہے ورنہ بنیادی تصور ایک ہی ہے۔

- مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "الدِّینُ القیِّم" میں ایک مثال کے ذریعے اِس مسئلے کو بہت آسان بنادیا ہے۔ آپ تصور کیجیے اپنے ذہن میں کسی عمارت کا۔ یہ تصور آپ کے ذہن کی تخلیق ہے۔ آپ کے ذہن میں قائم ہے اور آپ کی توجہ پر اِس کا دارومدار ہے۔ ذرا توجہ ہٹ جائے تو اُس کا کوئی وجود نہیں۔ آپ اپنے تصور میں قائم تخلیق کے اوپر بھی ہیں اور نیچے بھی۔ دائیں بھی ہیں بائیں بھی۔ باہر بھی ہیں اندر بھی ہیں۔ آپ ہی آپ ہیں۔ آپ کے بغیر اُس تخلیق کا کوئی حقیقی وجود علیحدہ سے نہیں ہے۔ بالکل یہی تمثیل ہے اللہ کی اور اُس کی تخلیق کردہ کائنات کی۔ اِس تمثیل پر یہ الفاظ کتنے صادق آتے ہیں کہ "ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو"۔ یہ سارا سلسلہ ہمارے چاروں طرف، ہمارے اوپر، ہمارے نیچے، ہمارے اندر، ہمارے باہر، یہ سب کچھ وجودِ باری تعالیٰ ہی تو ہے۔ اِس کائنات میں ہر آنؔ اور ہر جگہ وہ موجود ہے۔ اُس کی متعین شانیں بھی ہیں اور اُن متعین شانوں کا ارتکاز کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ اُس کی تجلیات کا ظہور کسی خاص Time & Space Complex میں بھی ہو سکتا ہے، لیکن جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ "وہی اوّل ہے، وہی آخر، وہی ظاہر ہے، وہی باطن"، بس وہ ہی وہ ہے۔

- هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ میں اول و آخر کی صفات سے زمان (Time) کا احاطہ ہو رہا ہے۔ اِس سلسلۂ کون و مکان کا اول بھی اللہ ہے آخر بھی وہی ہے۔ اول و آخر کے الفاظ زمانِ مسلسل کی دو انتہاؤں کو بیان کر رہے ہیں۔ اِن دو انتہاؤں کے مابین مکان (Space) کا پھیلاؤ ہے۔ اِس پھیلاؤ کا ظاہر بھی اللہ ہے اور باطن بھی وہی ہے۔ معلوم ہوا بس وہی وہ ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس کو تعبیر کیا صوفیا نے کہ لَآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ کا مفہوم ہے لَامَوْجُوْدَ اِلَّااللّٰهُ – "کوئی موجود نہیں سوائے اللہ کے"۔

- هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ کا مفہوم سمجھنے کے بعد وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کا مفہوم خود بخود واضح ہو گیا۔ جب وہی وہ ہے تو کسی شے سے اُس کی بے خبری کا کیا سوال؟ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ جب وہ ہر آن اور ہر جگہ موجود ہے تو کسی درجے میں بھی کہیں کوئی وسوسہ، کوئی خیال، کوئی گمان، کوئی مغالطہ، کوئی احساس وارد نہ ہو کہ کوئی شے اُس کے علم میں نہیں۔ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ یہاں پھر دیکھیے کہ وہی لفظ کل ہے اور اِسی لفظ کل کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا بھی بیان ہو رہا ہے کہ اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے خواہ ہمیں اِس کا شعور و ادراک ہو یا نہ ہو۔

- بہت سے فلسفی اِس بات پر متفق ہیں کہ اللہ عالمِ کُلیات ہے عالمِ جزئیات نہیں۔ بڑے بڑے قانون اور ضوابط تو اُس کے علم میں ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو اپنی ذات میں مگن ہے۔ قرآن اِس گمراہی کی نفی بار بار اِن الفاظ سے کرتا ہے کہ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔

- آیت 2 کے آخر میں الفاظ تھے وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اِس آیت 3 کے آخر میں الفاظ ہیں وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ اللہ کی یہی دو صفات ہیں جن پر قرآنِ حکیم میں بہت زور دیا گیا ہے کہ وہ ہر شے پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اِس کی ایک حکمت یہ ہے کہ درحقیقت اِنہی دو اعتبارات سے شیطان انسان کے ذہن میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان مر جائے، اُس کی ہڈیاں گل سڑ جائیں، اُس کے خلیات بھی تحلیل ہو چکے ہوں، اُسے دوبارہ زندہ کیا جا سکے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کا ہر ہر عمل اور عمل کی جزئیات بھی اللہ کے علم میں ہوں اور اُنہیں محفوظ کیا جا رہا ہو۔ اِن دونوں وسوسوں کا قرآنِ حکیم بار بار ازالہ کرتا ہے اِن الفاظ سے کہ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ "وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے" اور هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ "وہ ہر شے کا علم رکھنے والا ہے"۔

- تقدیر پر ایمان اللہ کی اِن دو صفات یعنی عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کو ماننے کا منطقی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر

اُس کی اجازت کے محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور اُس کی توفیق سے کرتے ہیں۔ اِس دنیا میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا بُرا، اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اللہ کا عاجز و لاچار ہونا لازم آتا ہے۔ پھر اللہ ہر شے کو جانتا ہے اور ہمیشہ سے جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اِس پوری کائنات میں ماضی میں کیا ہوا یا حال میں کیا ہو رہا ہے یا مستقبل میں کیا ہو گا۔ یہ سب حالات اُس کے علمِ قدیم میں پہلے سے موجود ہیں۔ کل مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ البتہ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ میں کل کرنے والا ہوں وہ اللہ کے علم میں ہے، لہٰذا میں مجبور ہوں کہ وہ کروں۔ اللہ کا مستقبل کے واقعات کا علم (Pre-knowledge) ہمارے لیے جبر محض (Pre-determination) کی دلیل نہیں۔ ہمیں عمل کرتے ہوئے ایک اختیار محسوس ہوتا ہے، بقول فانی بدایونی:

فانی ترے اعمال ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

آیت 4:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ... وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں ... ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ... پھر اس نے عرش پر استویٰ فرمایا ... یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا ... وہ جانتا ہے جو داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو نکلتا ہے اُس سے ... وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا ... اور جو اترتا ہے آسمان سے اور جو چڑھتا ہے اُس کی طرف ... وَ هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ... اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو ... وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس کو دیکھنے والا ہے۔

- چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر قرآنِ حکیم میں بار بار آیا ہے۔ اِس کائنات میں اللہ کے دو عالم کام کر رہے ہیں ایک عالمِ امر اور دوسرا عالمِ خلق۔ سورۃ الاعراف 7 آیت 54 میں ان دونوں عالموں کا ذکر ہے یعنی اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ہے۔ عالمِ امر کی شان یہ ہے کہ اُس

میں وقت کا عنصر نہیں اور اللہ کے احکام کا معاملہ كُنْ فَيَكُوْنُ کی شان کے ساتھ ظہور میں آتا ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (یٰسٓ 36:82)

"بے شک اُس (اللہ) کے امر کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ شے ہو جاتی ہے"۔

عالمِ خلق کا معاملہ برعکس ہے۔ یہاں اشیاء کے تکمیل پانے میں وقت لگتا ہے۔ بیج سے درخت بننے میں وقت لگتا ہے۔ جب آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہوئی تو یہ تخلیق بھی چھ دنوں میں مکمل ہوئی۔

- چھ دن کون سے ہیں؟ ہم اِن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ ہم تو اُس دن سے واقف ہیں جس میں زمین سورج کے اعتبار سے اپنے محور کے گرد گردش مکمل کرتی ہے۔ جب ابھی زمین و آسمان بنے ہی نہیں تھے تو اُس وقت، دن کا کیا تصور تھا ہم نہیں جان سکتے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے چھ مراحل میں زمین اور آسمان بنائے۔

- آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے ذکر کے بعد اِس آیت میں فرمایا گیا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ "پھر وہ بیٹھا تختِ حکومت پر"۔ گویا کائنات کا خالق بھی اللہ ہے اور حاکم بھی اللہ۔ مختلف اصطلاحات کے ساتھ کائنات کے ایک خالق کے ہونے کا تصور تو کئی فلاسفہ پیش کرتے ہیں لیکن اِس کے ساتھ ساتھ وحیٔ الٰہی کی رہنمائی سے محروم ہونے کی وجہ سے گمراہ کن نظریات بھی وابستہ کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک گمراہ کن فلسفیانہ تصور ہے کہ ایک خالق نے کائنات کو پیدا کیا اور اِس کے لیے کچھ طبعی و کیمیائی قوانین (Physical and chemical laws) بنانے کے بعد اِسے چھوڑ دیا۔ اب یہ کائنات اِن قوانین کے تحت خود بخود رواں دواں ہے۔ اِس بات کو یوں سمجھئے کہ آپ نے زور دار ٹھوکر ایک فٹ بال کو لگا دی ہے۔ اب وہ فٹ بال جا رہی ہے۔ آپ کا اب اُس فٹ بال سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کے ایک سائنس زدہ ذہن (Scientific mind) کا یہ تصور خالق اور کائنات کے بارے میں ہے۔ اِس قسم کے ذہن کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ کائنات کے ہر معاملہ میں اور ہر آن و ہر لحظہ اللہ ہی کی مرضی اور اللہ ہی کا

فیصلہ جاری و ساری ہے۔ اِس آیت میں اللہ نے اِس غلط تصور کی نفی کر دی کہ اللہ نے صرف کائنات نہیں بنائی بلکہ وہ ہی تختِ حکومت پر بیٹھ کر کائنات کے مختلف امور کی تدبیر بھی کرتا ہے اور وہی اِس کائنات کے نظام کو چلا بھی رہا ہے۔ یہ کائنات اپنے ہر معاملے کے لیے اللہ کی توجہ اور اُس کے حکم کی محتاج ہے۔

- اِس آیت میں اللہ کی صفتِ علم کو پھر دیکھیے کہ وہ کس شان سے آ رہی ہے۔ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا "وہ جانتا ہے جو داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو نکلتا ہے اُس سے"۔ پانی کا ہر قطرہ جو زمین میں جذب ہوتا ہے، درختوں سے گرنے والے پھولوں سے وہ ہر بیج جو زمین کے اندر پڑتا ہے، اللہ کے علم میں ہے۔ ایک ایک بیج کو اللہ پالتا ہے۔ پھر کسی بیج سے کونپل کا کوئی سر از مین سے نہیں نکلتا مگر وہ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ یہ سب از خود نہیں ہو رہا اللہ کی مشیّت سے ہو رہا ہے۔ وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا "اور (اللہ جانتا ہے) جو اترتا ہے آسمان سے اور جو چڑھتا ہے اُس کی طرف"۔ آسمان سے نازل ہونے والے بارش کے ہر قطرے اور اللہ کا حکم لے کر اترنے والے ہر فرشتہ کا اللہ کو علم ہے۔ اِسی طرح آسمان کی طرف اُٹھنے والے بخارات اور آسمان کی طرف جانے والے فرشتوں سے بھی اللہ باخبر ہے۔ صرف ایک خالق کو مان لینا کافی نہیں بلکہ اُس اللہ کو ماننا مطلوب ہے جس کی صفاتِ اعلیٰ سے قرآنِ حکیم ہمیں متعارف کراتا ہے۔

- وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ "اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو"۔ اللہ کی معیت کی دو شانیں ہیں۔ ایک ہے عمومی معیت یعنی اللہ ہر جگہ ہے اور ہر انسان کے ساتھ ہے۔ اُس کی موجودگی کی کیفیت کو ہم نہیں جان سکتے۔ ہم یہ نہیں جانتے وہ کیسے موجود ہے لیکن وہ کسی خاص جگہ یا سمت میں محدود نہیں ہے۔ سورۃ البقرۃ[2] آیت 115 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ

"اور مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں۔ پس تم جہاں بھی رخ کرو گے موجود ہو گا اللہ"۔

ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ وہ کسی ایک خاص جگہ پر موجود ہے اور اُس کا وجود کائنات میں ہر جگہ نہیں ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ کے بارے میں بالعموم یہ

تصور ہے کہ وہ صرف اپنی صفات کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے۔ یعنی ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہماری باتیں سن رہا ہے۔ یہ تصور محض ایک تاویل ہے۔ یہ تاویل درحقیقت اِن الفاظ کا حق ادا نہیں کر رہی کہ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ "اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو"۔ وہ ہمارے ساتھ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے، لیکن وہ ہمارے ساتھ ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے۔ وہ عرش پر متمکن ہے لیکن صرف وہیں محدود نہیں۔ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے۔

- دوسری ہے اللہ کی معیتِ خصوصی جو اللہ کے نیک بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں آیا اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے غارِ ثور میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے عین اُس وقت جب کہ دشمن غار کے دہانے پر پہنچ گیا تھا فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبۃ 9: 40) "غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ اِسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے بنو اسرائیل کو لے کر نکلے تو فرعون نے اپنے لشکروں سمیت آپ کا پیچھا کیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ فرعون کا لشکر قریب آ پہنچا اور آگے دریا تھا، ایسے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اطمینان سے فرمایا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (الشعراء 26: 62) "میرے ساتھ میرا رب ہے وہ عنقریب میرے لیے راستہ نکال دے گا"۔

- وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ کا لازمی نتیجہ ہے وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یعنی جب اللہ ہر جگہ موجود ہے تو وہ عینی شاہد ہے ہر عمل کا۔ وہ دیکھنے والا ہے اُسے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو۔ اُسے کسی کے باخبر کرنے (Reporting) کی احتیاج نہیں ہے۔ فرشتے جو نامۂ اعمال تیار کر رہے ہیں وہ صرف تم پر اتمامِ حجت کے لیے ہے ورنہ اللہ تو بذاتِ خود دیکھ رہا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے؟

آیت 5:

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ... اُسی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں اور زمین کی ... وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ اور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تمام معاملات۔

- لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے الفاظ آیت نمبر 2 میں اِس سے قبل آ چکے ہیں۔ اِن الفاظ کو دوبارہ اِس لیے لایا گیا کہ اللہ کو ماننے والوں کی اکثریت اللہ کو خالق تو مان لیتی ہے لیکن بادشاہ مان کر اُس کے احکامات کے نفاذ کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ درحقیقت اللہ کی بادشاہت اور اُس کی حاکمیت پر مبنی نظام قائم کرنے کا تصور خلافت راشدہ کے بعد رفتہ رفتہ ذہنوں سے محو ہوتا گیا۔ جب خلافت ختم ہوئی تو ملوکیت کا آغاز ہو گیا۔ اُس وقت اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لیے کچھ کوششیں ہوئیں لیکن دنیوی اعتبار سے یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اِس کے بعد مسلمانوں نے ذہناً تسلیم کر لیا کہ اب یہ حکومت اور ریاست کا معاملہ تو قوت کے بل پر چلے گا۔ جس کے پاس طاقت ہو گی وہی حکومت کرے گا۔ اللہ کی حکومت کا تصور ہی مسلمانوں کے ذہن سے نکل گیا اور دین کو محض چند عقائد، عبادات اور رسومات تک محدود سمجھ لیا گیا۔ اب دین کا تصور صرف یہ رہ گیا کہ اللہ کو ایک مانو، اللہ کے لیے نماز پڑھو، روزے رکھو، زکوٰۃ دو اور اُس کے گھر کا حج کرو۔ اِن چھ آیات میں دو مرتبہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے الفاظ کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تصور کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ انسان کا خود حاکم بن کر بیٹھ جانا ایک بہت بڑا فساد اور اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ جو اللہ کا وفادار ہے اُس کا فرض ہے کہ اِس بغاوت کا قلع قمع کرے تاکہ اللہ کا حقِ حاکمیت بحال (Restore) ہو اور زمین پر اللہ کی حاکمیت بالفعل قائم ہو جائے۔

- اِس آیت کے اگلے حصّے میں خبردار کیا گیا وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ "اور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے تمام معاملات"۔ اللہ کے بادشاہ ہونے کا ایک منطقی نتیجہ ہے کہ تمام معاملات اُسی کی عدالت میں پیش کیے جائیں اور آخری فیصلہ کا اختیار اُسی کو حاصل ہو۔ گویا یہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے درمیان منطقی ربط ہے۔ یہاں اسلوب مجہول کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خواہی نہ خواہی، پسند ہو یا ناپسند، تم چاہو یا نہ چاہو لیکن تمام معاملات اللہ کے دربار میں پیش ہوں گے۔ اُس روز کی شرمندگی سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں اللہ کو بادشاہِ حقیقی سمجھ کر اُس کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

آیت 6:

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ ... وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں ... وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ... اور وہ داخل کرتا ہے دن کو رات میں ... وَ هُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اور وہ واقف ہے اُن رازوں سے جو سینوں میں ہیں۔

1. اِس آیت میں یہ حقیقت واضح کی گئی کہ یہ سلسلۂ روز و شب اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک عظیم آیت ہے۔ یہ رات اور دن کا نظام خود بخود نہیں چل رہا بلکہ یہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ سورۃ القصص[28] آیات 71-73 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

"(اے نبی ﷺ) پوچھیے کیا تم دیکھتے ہو اگر اللہ رات کو تم پر مسلسل طاری کر دے روزِ قیامت تک کے لیے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہارے لیے دن کی روشنی لا سکے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ (اے نبی) پوچھیے کیا تم دیکھتے ہو اگر اللہ دن کو تم پر مسلسل جاری کر دے روزِ قیامت تک کے لیے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہارے لیے رات کو لا سکے جس میں تم سکون حاصل کرتے ہو؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یہ اُس (اللہ) کی رحمت میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے دن اور رات بنائے تاکہ تم سکون حاصل کرو رات میں اور اللہ کے فضل میں سے تلاش کرو دن میں اور تاکہ تم شکر کرو"۔

يُوْلِجُ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ پرو لاتا ہے رات کو دن میں اور پرو لاتا ہے دن کو رات میں۔ رات اور دن کا یہ نظام گویا کہ ایک ایسی تسبیح کے مانند ہے جس میں سیاہ اور سفید دانے ایک دوسرے کے بعد پرو دیئے گئے ہوں۔ سیاہ دانہ گرا تو یہ رات ہے اور سفید دانہ گرا تو یہ دن ہے، بقولِ اقبال:

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

یُوۡلِجُ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کبھی دن بڑھتا ہے اور رات گھٹ جاتی ہے، گویا کہ اللہ دن کو رات میں داخل کر رہا ہے۔ پھر کبھی رات بڑھتی ہے اور دن گھٹتا ہے، گویا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کر رہا ہے۔

2. وَ هُوَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ کے الفاظ کے ذریعے اِن آیات میں تیسری بار اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم پر زور دیا گیا۔ یہاں اشارہ اصل میں محاسبۂ اخروی کی طرف ہے جس روز حُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوۡرِ (العادیات 100: 10) "جانچا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے" کا معاملہ ہو گا۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ سینوں کے اندر ہے یعنی اللہ اُن نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے جن پر اعمال کا دارومدار ہوتا ہے۔

یہاں وہ چھ آیات ختم ہوئیں جن کے بارے میں عرض کیا گیا تھا ان میں کہ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا بیان انتہائی جامعیت کے ساتھ، بہت سے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے اور بعض اعتبارات سے اعلیٰ ترین علمی سطح پر وارد ہوا ہے۔

سورۃ الحدید حصّہ دوم: آیات 7 تا 11

دین اسلام کے تقاضے

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ
اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷ وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا
بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ
بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا
تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ
قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا
وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا
فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱

تمہیدی نکات:

1. سورۂ حدید کا دوسرا حصہ پانچ آیات یعنی آیات 7 تا 11 پر مشتمل ہے۔ اِس حصے میں بڑی جامعیت کے ساتھ دین کے کل تقاضے صرف دو الفاظ "ایمان" اور "انفاق" کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔

2. سورۂ حدید کے پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا بیان آیا تھا۔ اِس حصے میں دین کے تقاضے کچھ اِس طرح سامنے آئے ہیں کہ کوئی مانے یا نہ مانے اور کسی کو شعور ہو یا نہ ہو، یہ تو حقیقت ہے کہ کائنات کا ایک خالق ہے، کائنات کی ہر شے اُس کی تسبیح کر رہی ہے، وہی کائنات کا بادشاہ اور مالک ہے جو تختِ حکومت پر متمکن ہے، ہر ہر شے اُس کے علم میں ہے، ہر

ہر لحظہ اُسی کا حکم جاری و ساری ہے اور انسانوں کے نفع و نقصان اور کامیابی و ناکامی کا کل اختیار اُسی کو حاصل ہے۔ لہٰذا فوز و فلاح اور کامیابی صرف اُن کے لیے ہے جو اللہ پر ایمان لا کر اُسی کو مطلوب و مقصود بنالیں اور اُس کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

3. نحو کی اصطلاح میں یوں کہیں گے سورۂ حدید کا پہلا حصہ کلامِ خبریہ کی صورت میں ہے کہ ایسا ہے اور ایسا ہو رہا ہے۔ اب دوسرے حصے میں کلامِ انشائیہ آرہا ہے۔ انسان کی خیر اِسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور اُس کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں لگادے، کھپادے۔

4. سورۂ حدید کے اِس حصے میں حسنِ ترتیب اور حسنِ توازن کے ساتھ انتہائی مرتب انداز میں دین کے تقاضے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلی آیت میں جامعیت کے ساتھ دین کے جملہ تقاضوں کو دو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد اِن میں سے ہر ایک تقاضے پر دو دو آیات آرہی ہیں۔ ایک ایک آیت میں ذرا جھنجھوڑنے اور ملامت کا انداز ہے اور ایک ایک آیت میں ترغیب و تشویق کے اسلوب میں اِن تقاضوں کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا گیا۔ پہلی آیت میں تقاضوں کے بیان میں اجمال ہے اور بعد میں اِن کی تفصیل ہے۔

آیت 7:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ... ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول ﷺ پر... وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ... اور خرچ کرو ہر اُس شے میں سے جس پر تمہیں عارضی اختیار دیا گیا ہے... فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور خرچ کرتے رہے اُن کے لیے بڑا ثواب ہے۔

- اِس آیت میں دین کے دو تقاضے بیان ہوئے ہیں ایمان اور انفاق۔ منتخب نصاب کا پہلا حصہ سورۃ العصر 103 کی روشنی میں دین کے چار تقاضوں کو بیان کرتا ہے یعنی ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ تواصی بالحق کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا دعوت الی اللہ کے الفاظ بھی آگئے تھے۔ منتخب نصاب کے چوتھے حصے کے تیسرے سبق سورۃ الصف 61

میں دین کے تقاضے دو اصطلاحات میں بیان کیے گئے یعنی ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ۔ ایمان جب حقیقی ہو گا تو اِس میں عمل آپ سے آپ آجائے گا۔ قانونی سطح پر ایمان اور عمل جدا ہیں۔ حقیقت کی سطح پر یہ دونوں ایک وحدت ہیں۔ اِسی طرح جہاد فی سبیل اللہ، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر دونوں کا مجموعہ ہے۔ سورۂ حدید کی اِس آیت میں بھی دین کے تقاضے دو ہی اصطلاحات میں ہیں یعنی ایمان اور انفاق۔ گویا یہاں انفاق کی اصطلاح جہاد کی اصطلاح کے مترادف کے طور پر آئی ہے۔

- اِس آیت میں دین کا پہلا تقاضا آیا کہ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر۔ یہ بات اِس سے قبل ہمارے سامنے آچکی ہے کہ اِس سورت میں خطاب کا رُخ صرف مسلمانوں کی طرف ہے۔ گویا مسلمانوں سے کہا جا رہا کہ ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ تمہیں "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" یعنی زبانی اقرار کی بنیاد پر قانونی ایمان تو حاصل ہے لیکن اب " تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ" یعنی یقینِ قلبی کے حصول کی کوشش کر کے ایمانِ حقیقی سے باطن کو منور کرو۔ یہ وہی انداز ہے جو آیا سورۃ النساء[4] کی آیت 136 میں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ

"اے اہل ایمان! ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر"۔

پھر سورۃ الصف[61] آیات 10-11 میں بھی اِسی اُسلوب کو اختیار کیا گیا کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں بچا لے دردناک عذاب سے۔ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جان لو"۔

گویا دین کا پہلا تقاضا ہے ایمانِ حقیقی کا حصول۔ ایسا ایمان جو انسان کا حال بن جائے اور انسان کے سیرت و کردار میں نظر آئے۔ یہ ایمان کیسے حاصل ہو گا؟ اِس کی وضاحت آگے آیت 9

میں آرہی ہے۔

- ایمان کے حوالے سے یہاں صرف دو ایمانیات کا ذکر ہے یعنی توحید اور رسالت۔ توحید تو تمام ایمانیات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ رسالت پر ایمان کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اُن تمام باتوں کی تصدیق کرنا جو بیان فرمائیں اللہ کے رسول ﷺ نے۔ گویا باقی تمام ایمانیات بھی ایمان بالرسالت میں شامل ہو گئے۔

- اِس آیت میں دین کا دوسرا تقاضا بیان ہوا وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ "اور خرچ کرو ہر اُس شے میں سے جس پر تمہیں عارضی اختیار دیا گیا ہے"۔ آگے چل کر آیت 10 میں واضح ہو گا کہ خرچ کرنے سے مراد ہے انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے خرچ کرنا۔ عام طور پر خیال ہے کہ لفظِ انفاق سے مراد صرف مال خرچ کرنا ہے۔ یہ خیال اِس لیے پیدا ہوا کہ اکثر و بیشتر جہاں قرآنِ حکیم میں مال خرچ کرنے کی تاکید آئی ہے وہاں انفاق کا لفظ آیا ہے۔ یہاں یہ لفظ وسیع معنی میں آیا ہے یعنی خرچ کرو ہر وہ شے جس پر اللہ نے تمہیں خلافت یعنی عارضی اختیار دیا ہے۔ گویا حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی جسمانی صلاحیتوں اور قوتوں کو، اپنے مال و اسباب اور وسائل و ذرائع کو اور اپنی اولاد کو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے لگا دو۔ اِس سے پہلے ہم سمجھ چکے ہیں کہ یہاں انفاق کی اصطلاح جہاد کی اصطلاح کے مترادف کے طور پر آئی ہے۔ جس طرح جہاد مال اور جان دونوں سے ہوتا ہے اِسی طرح انفاق بھی مال و جان دونوں ہی کا کرنا ہو گا۔

- اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اپنا سارا مال لگا دو۔ اللہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اپنے جسم اور جان کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں ہماری راہ میں لگا دو، بلکہ اُس کا مطالبہ یہ ہے کہ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ "جن جن چیزوں میں تمہیں عارضی اختیار عطا کیا گیا ہے اُن میں سے ہماری راہ میں لگاؤ"۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں "کتنا؟" لگایا جائے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اعلیٰ ترین درجہ سورۃ البقرۃ[2] آیت 219 میں بیان ہوا:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ

"(اے نبی ﷺ!)وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو"۔

دین کی سربلندی کی جدوجہد اُسی وقت کامیاب ہوگی جب ہماری ایک قابلِ ذکر تعداد ایمان کے اِس درجہ پر پہنچ جائے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اُسوے پر عمل کرتے ہوئے اپنا سب کچھ اللہ کے دین کے لیے وقف کر دے۔ ہاں زندگی کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ اللہ کی عطا کردہ ایک نعمت ہے اور اسے اِس لیے برقرار رکھنا ہے تاکہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے محنت اور جدوجہد کی جاسکے۔ لہٰذا اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گذر اوقات کے لیے صرف اتنا لگایا جائے کہ جس سے اُن کی بنیادی ضروریات پوری ہوجائیں۔ گویا زندگی minimum subsistence level پر گزارتے ہوئے باقی سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دیا جائے، بقولِ اقبال:

جو حرفِ قُلِ العَفْو میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

- اِس آیت میں مُسْتَخْلَفِيْنَ کا لفظ در اصل اسم المفعول ہے جس کا مفہوم ہے وہ لوگ جنہیں خلافت دی گئی۔ یہ لفظ واضح کر رہا ہے کہ ہماری کوئی حیثیت ہے ہی نہیں۔ ہر شے کا اصل مالک اللہ ہے۔ اُس نے ہمیں بطورِ امانت اور برائے امتحان کچھ چیزوں پر عارضی اختیار دیا ہے۔ اِن میں ہمارا جسم، توانائی، علم، ذہانت وفطانت، دُور بینی و دُور اندیشی، وقت، صحت، قوتِ کار، عمر، خاص طور پر جوانی، مال واسباب، گھر، سواری، اولاد وغیرہ شامل ہیں۔ روزِ قیامت سوال ہوگا کہ ہم نے اِن نعمتوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق اُس کی راہ میں لگایا یا نہیں۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَ اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَ اَبْلَاهُ وَمَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَ

أَنْفَقَهُ وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ[1]

"روزِ قیامت ابنِ آدم کے قدم ہل نہ سکیں گے اپنے ربّ کے پاس سے جب تک اُس سے پانچ باتوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے۔ زندگی کے بارے میں کہ کہاں لگادی، جوانی کے بارے میں کہ کہاں کھپادی، مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور جو علم حاصل کیا اُس پر کتنا عمل کیا"۔

اِسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ[2]

"تم میں سے ہر اک نگران ہے اور اُس سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں باز پرس ہوگی"۔

- آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ "جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور خرچ کرتے رہے اُن کے لیے بڑا اجر ہے"۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔ مال، اولاد، گھر، سواری، جسمانی قوت، ذہانت وغیرہٗ۔ اگر ہم یہ سب اللہ کے دین کے لیے لگادیں تو کوئی بڑی بات نہیں:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لیکن اِس کے باوجود اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں اور اپنی راہ میں مال و اسباب لگانے والوں کو بڑے اجر کی خوشخبری دے رہا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ (یونس 10:60)

"بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔

---

(۱) سنن ترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله ﷺ، باب ما جاء في شان الحساب و القصاص، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالَى وَ { أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ }، عن عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ

آیت 8:

وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ ... اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر؟ ... وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ ... حالانکہ رسول تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر ... وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اور (رسول) لے چکے ہیں تم سے عہد اگر تم (واقعی) مومن ہو۔

- اِس آیت میں دین کے پہلے تقاضے یعنی ایمان کے حوالے سے جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارا ایمان سیرت و کردار میں نظر کیوں نہیں آ رہا۔ اللہ کے نزدیک تو ایمان والے وہ ہیں جن کا نقشہ سورۃ الحجرات[49] کی آیت 15 میں یوں کھینچا گیا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

"مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک میں نہ پڑے اور اُنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی لوگ سچے ہیں"۔

اِسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا ایمان کے حوالے سے ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ[1]

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی خواہش نفس اُس شریعت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں"۔

گویا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو ایسا ایمان مطلوب ہے کہ جس کے نتیجہ میں نہ صرف انسان کا اپنا عمل شریعت کے مطابق ہو بلکہ وہ اجتماعی زندگی میں بھی شریعت کے نفاذ کے لیے مال اور جان سے جہاد کر رہا ہو۔

- وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ تمہیں کسی غیر پر ایمان لانے کی دعوت نہیں دے رہے بلکہ ایک ایسی ہستی پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے

(۱) شرح السنة، كتاب الإيمان، باب رد البدع والأهواء عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

ہیں جو تمہارا رب یعنی محسنِ حقیقی ہے۔ اُسی نے تمہیں پیدا کیا، وہی تمہارا مالک ہے اور وہی تمہارا وہ رازق ہے جو تمہاری تمام ضروریات پوری کر کے تمہیں پال رہا ہے۔ شکر گزاری اور احسان مندی کا تقاضا ہے کہ اپنے رب پر نہ صرف ایمان لایا جائے بلکہ دل و جان سے اُس کے احکامات کی اطاعت کی جائے۔

- وَ قَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَكُمْ کے الفاظ میں اُس عہد کی طرف اشارہ ہے جو کلمہ پڑھ کر ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ یہ عہد سورۃ التوبۃ[9] آیت 111 میں بیان ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ

"بے شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جانیں اور مال خرید لیے ہیں جنت کے عوض وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، قتل کرتے ہیں (کافروں کو) اور قتل کیے جاتے ہیں"۔

اِس عہد کی رُو سے ہم اپنی جان اور اپنے مال کا اللہ کے ہاتھ سودا کر چکے ہیں اور یہ مال و جان ہمارے پاس اللہ کی امانتیں ہیں۔ ایفائے عہد اور ادائے امانت کا تقاضا ہے کہ اب مال و جان اللہ کی اطاعت اور دین کی سربلندی کے لیے اِس طرح وقف کر دیے جائیں کہ ہم قتال فی سبیل اللہ کی طرف لے جانے والی راہ پر چل کر فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ کی سعادت حاصل کر سکیں۔

آیت 9:

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ... وہی تو ہے جو نازل کرتا ہے اپنے بندے پر واضح آیات ... لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ ... تاکہ نکال لائے تمہیں اندھیروں سے روشنی میں ... وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ اور بے شک اللہ تم پر نہایت شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

- اِس آیت میں رہنمائی فرما دی گئی کہ دین کا پہلا تقاضا پورا کرنے یعنی ایمانِ حقیقی کے حصول کا ذریعہ ہے قرآنِ حکیم۔ فرمایا اللہ نے اپنے بندے یعنی نبی اکرم ﷺ پر وہ واضح آیات نازل فرمائی ہیں جن سے وہ تمہیں اندھیروں سے "نور" کی طرف لا رہے ہیں۔ یہ اندھیرے بے یقینی کے ہیں، شرک کے ہیں، کفر و الحاد کے ہیں، مادیت کے ہیں، حرص و ہوا کی غلامی کے ہیں۔ نور سے مراد ہے ایمانِ حقیقی۔ سورۃ النور[24] کی آیت 35 میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قرآنِ حکیم

میں ایمان کو نور کہا گیا ہے جو نورِ فطرت اور نورِ وحی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سورۃ التغابن[64] کی آیت 8 میں قرآنِ حکیم کے لیے بھی لفظ "نور" آیا ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِیْۤ اَنْزَلْنَا

"پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا"۔

قرآن از خود نور ہے اور در حقیقت اِسی سے نورِ ایمان حاصل ہوتا ہے۔ گویا ایمانِ حقیقی کے حصول کا ذریعہ ہے قرآنِ حکیم کی واضح آیات پر غور و فکر۔ آیت کے معنی ہوتے ہیں نشانی۔ اِس کے ذریعے سے انسان کے قلب میں موجود ایمان تازہ اور شعور کی سطح پر اجاگر ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی اِن واضح آیات کی تلاوت کے ذریعے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں کو نورِ ایمان سے اِس طرح منور کیا کہ وہ شرک، الحاد اور مادہ پرستی سے تائب ہو گئے۔ توحید اُن میں سرایت کر گئی، اُن کی نگاہ میں دنیا کی حقیقت مچھر کے پر سے بھی کم ہو گئی، فکر آخرت اُن پر طاری ہو گئی اور رسالت کو وہ نوعِ انسانی کے لیے ایک عظیم رحمت سمجھنے لگے۔ بقول مولانا ظفر علی خان:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈھے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

سورۃ الانفال[8] آیت 2 میں قرآن کی تاثیر بیان کی گئی:

وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا

"اور جب اُن پر اُس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو یہ اُن کے ایمان کو بڑھا دیتی ہیں"۔

سورۃ الشوریٰ[42] آیت 52 میں بیان کیا گیا کہ خود نبی اکرم ﷺ کے ایمان کی تکمیل بھی قرآنِ حکیم کے ذریعے ہوئی:

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِیْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

"(اے نبی ﷺ) آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی جانتے تھے ایمان کو لیکن ہم نے اِس (قرآن) کو نُور بنایا ہے جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس

کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور بے شک اب آپ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے رہے ہیں"۔

- اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایمانِ حقیقی کے حصول کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (آلِ عمران 3:139)

"تم ہی غالب ہو گے بشرطیکہ مومن ہو"۔

پھر کسی معاشرے میں تبدیلی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے اُن افراد کی سوچ اور فکر کو بدلا جائے جو اپنی صلاحیت کے اعتبار سے دانشور ہوتے ہیں اور معاشرے کے باقی لوگ اُن کے دیے ہوئے نظریات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ معاشرے کی وہ ذہین اقلیت (Intelligentsia) یا (Intellectual elite) ہے جسے معاشرے کا brain trust کہا جاتا ہے۔ یہی ذہین اقلیت معاشرے کا رُخ معین کرتی ہے۔ اگر یہ "ذہین اقلیت" دولتِ ایمان سے محروم رہتی ہے اور کچھ دیگر افراد ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں تو کچھ جزوی سی اصلاح ہو جائے گی لیکن اُس معاشرے میں بحیثیت مجموعی کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہو گی یعنی دین کی سربلندی کی منزل سر نہ ہو گی۔ چنانچہ معاشرے کی بحیثیت مجموعی اصلاح کے لیے ذہین اقلیت کے قلوب میں ایمان کی آبیاری بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اِس طبقے میں ایمان کی آبیاری کا ذریعہ صرف اور صرف قرآنِ حکیم ہے۔ قرآنِ حکیم ایک انسان کے احساسات و جذبات کو بھی اپیل کرتا ہے اور اس کے تعقل و تفکر کو بھی۔ قرآنِ حکیم بار بار تعقل و تفکر کی دعوت دیتا ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ "کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟" قرآنِ حکیم میں جہاں ایک عام انسان کے لیے ہدایت ہے وہاں بڑے سے بڑے فلسفی کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب بھی ہے۔ قرآنِ حکیم ہی میں وہ حکمت کے موتی ہیں جو ہر دور کی اعلیٰ علمی سطح پر ذہین عناصر کو متاثر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا دین کی سربلندی کے لیے جس علمی و فکری سطح کا ایمان درکار ہے اُس کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔

- اِس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں رَءُوْفٌ اور رَحِیْمٌ ۔سورۃ التوبۃ[9] کی آخری آیت میں یہ دونوں صفات اِسی ترتیب کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے لیے بھی آئی ہیں۔اِسی سورۂ حدید کی آیت 27 میں فرمایا گیا کہ یہ دو صفات یعنی رأفت اور رحمت اللہ نے اُن لوگوں کے دلوں میں بھی رکھ دی تھیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی تھی۔اِن دونوں صفات کے مابین بڑا گہرا ربط اور تعلق ہے۔کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ جانا اور اُس کے دکھ کو اپنے اندر محسوس کرنا رأفت ہے۔ پھر اُس کے دکھ کو دور کرنے پر آمادہ اور متوجہ ہو جانا رحمت ہے۔ایک ہی عمل کے یہ دو رخ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ رؤوفی اور شانِ رحیمی کا سب سے بڑا مظہر ہے قرآنِ حکیم جو اُس نے اپنے بندے حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا تاکہ وہ اللہ کے بندوں کو عقائد و اعمال کے حوالے سے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں۔ اب اللہ کے یہ بندے دنیا میں بھی افراط و تفریط کے دھکوں سے بچیں گے اور آخرت میں بھی دردناک عذاب سے محفوظ ہو جائیں گے۔واقعی اللہ بندوں کے حق میں رؤوف اور رحیم ہے۔

آیت 10:

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ . . . اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں . . . وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ . . . حالانکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کے لیے ہے . . . لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ . . . برابر نہیں تم میں سے وہ جس نے خرچ کیا فتح سے پہلے اور جنگ کی . . . اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ . . . ایسے لوگوں کا درجہ اُن لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی . . . وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ . . . اور اللہ نے سب سے وعدہ کیا بڑی بھلائی کا . . . وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۠ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

- اِس آیت کے شروع میں دین کے دوسرے تقاضے "انفاق" کے حوالے سے جھنجھوڑا گیا کہ تمھیں کیا ہوا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں حالانکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کے لیے ہے۔ہر شے کا حقیقی مالک اور وارث اللہ ہے۔ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے امانت

ہے۔ ہمارا امتحان ہے کہ ہم اِسے اللہ کی خوشنودی کے لیے لگاتے ہیں یا بچا بچا کر کسی اور کے فائدہ کے لیے رکھ کر خود محروم رہ جاتے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

مال و اسباب در حقیقت چلتی پھرتی دولت ہے۔ آج کسی کے پاس ہے اور کل کسی کے پاس۔ یہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہو رہی ہے۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو جا رہی ہے۔ بالآخر یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے رہ جائے گا۔ کوئی باقی نہ ہو گا جو اِس پر دعویٰ کر سکے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

يَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِيْ مَالِيْ وَهَلْ لَّكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ مِنْ مَالِكَ إِلاَّ مَا اَكَلْتَ فَاَفْنَيْتَ اَوْ لَبِسْتَ فَاَبْلَيْتَ اَوْ تَصَدَّقْتَ فَاَمْضَيْتَ(۱)

"انسان کہتا ہے میرا مال، میرا مال حالانکہ اے انسان! تیرا مال (ایک تو وہ ہے) جو تو نے کھا کر ختم کر دیا، یا (دوسرا) پہن کر بوسیدہ کر دیا، یا (تیسرا) صدقہ کر کے (آخرت کے لیے) آگے بھیج دیا"۔

اِسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا:

أَيُّكُمْ مَالُ وَارِثِهٖ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ مَالِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ مَا مِنَّا أَحَدٌ إِلَّا مَالُهٗ أَحَبُّ إِلَيْهِ قَالَ فَإِنَّ مَالَهٗ مَا قَدَّمَ وَمَالُ وَارِثِهٖ مَا أَخَّرَ(۲)

"آپ لوگوں میں سے کون ہو گا جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ عزیز ہو؟" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے خود اپنا مال (وارث کے مال سے) محبوب تر نہ ہو۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا "اُس کا مال تو وہ ہے جو اُس نے آگے بھیج دیا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو اُس نے پیچھے چھوڑا"۔

اِس حدیث کی رُو سے ہمارا مال صرف وہی ہے جو ہم اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کے اندر خرچ کرتے ہیں، باقی مال جو ہم جمع کر رہے ہیں وہ در حقیقت وارثوں کا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، باب، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ الشِّخِّيْرِ رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب مَا قَدَّمَ مِنْ مَالِهٖ فَهُوَ لَهٗ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ مسعود رضی اللہ عنہ

- مال کے حوالے سے یہ بات پیش نظر رہے کہ ضرورت سے زائد جمع نہ کیا جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک وعظ کا مفہوم ہے:

> "Do not store up for yourselves treasures on earth, where moths and vermin destroy, and where thieves break in and steal. But store up for yourselves treasures in heaven, where moths and vermin do not destroy, and where thieves do not break in and steal. For where your treasure is, there your heart will be also."[1]
>
> "اپنا مال زمین پر جمع نہ کرو، جہاں کیڑا بھی خراب کرتا ہے اور چوری کا بھی خوف ہے بلکہ آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے، نہ چوری کا خوف ہے۔ کیونکہ جہاں تمہارا مال ہو گا وہیں تمہارا دل ہو گا"۔

اگر ہم نے مال یہیں جمع کیا تو دل بھی یہیں پر لگا رہے گا۔ دنیا سے جانے کو دل نہیں چاہے گا اور موت کے فرشتے دھکے دے دے کر زبردستی لے کر جائیں گے۔ ایک حدیث میں الفاظ آتے ہیں کہ جیسے کانٹے دار جھاڑی پر کپڑا ڈال کر کھینچا جائے اِسی طریقے سے ایسے لوگوں کی روحیں کھینچی جائیں گی۔ اِس کے برعکس جس نے مال آگے بھیجا ہو گا وہ موت کے لیے ہر وقت تیار ہو گا اور بقول اقبال موت کے وقت اُس کی کیفیت یہ ہو گی کہ:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلبِ اوست!

ایک حدیث کی رُو سے ایسے لوگوں کے لیے موت ایسے ہو گی جیسے کہ ایک بند مشکیزے میں سے ایک بوند پانی ٹپک جائے[2]۔ اُن کے لیے یہاں سے نقل مکانی کرنے میں کوئی ناگواری نہیں ہو گی، کوئی سختی نہیں ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی ہی موت عطا فرمائے۔ آمین!

- آیت کے اگلے حصے میں فرمایا کہ برابر نہیں ہیں وہ جنہوں نے فتح سے قبل اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جنگ کی۔ مختلف حالات کے اعتبار سے انسان کے عمل کی قدر و قیمت اور اجر و ثواب میں

---

[1] (Matthew, Chapter 6, Verses 19-21)

(۲) المستدرك على الصحيحين للحاكم، كتاب الايمان، باب أَمَّا حَدِيثُ مَعْمَرٍ، عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضی اللہ عنہ

زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ حالات نامساعد ہوں، مخالفتیں عروج پر ہوں، دشمن اپنی قوت و وسائل کی بنیاد پر دندنا رہا ہو اور جان و مال کو ہر وقت خطرات لاحق ہوں تو ایسے میں کسی تحریک کے لیے مال و جان کی بازیاں لگانے والوں کے درجات بہت بلند ہیں۔ اِس کے برعکس جب کوئی تحریک ایک ابھرتی ہوئی طاقت کی حیثیت سے سامنے آچکی ہو تو اب تو بہت سے لوگ اُس کے معاون بن جائیں گے۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اسلام مغلوب تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کی اِس غربت کے دور میں قربانیاں دیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام غالب ہو گیا۔ اِس تھوڑے سے عرصہ کی قربانیوں سے اُنہوں نے اپنے لیے عظیم درجات کے حصول کا سامان کر لیا۔ اِس دور میں بھی دینِ اسلام دنیا میں مغلوب ہے اور مخالفین بڑے منظم انداز سے اِس کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، بقول حالی:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اور

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

دین کی مغلوبیت کے اِس دور میں اگر ہم اِس کی سربلندی کے لیے مال و جان لگاتے ہیں تو ہم بھی بہت عظیم اجر و ثواب کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اِرشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ[1]

"اسلام کا آغاز ہوا تھا جبکہ یہ مغلوب تھا اور عنقریب یہ مغلوب ہو جائے گا تو خوشخبری ہے

(1) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان أن الإسلام بدأ غریبا...، عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ

اُس وقت اسلام کا ساتھ دینے والوں کے لیے"۔

- آیت کے اگلے حصے میں فرمایا کہ ایسے لوگ جنہوں نے فتح سے قبل اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے انفاق کیا اور جنگ کی، بہت عظیم درجات کے حامل ہوں گے اُن کے مقابلے میں جنہوں نے بعد میں اللہ کی راہ میں انفاق کیا اور جنگ کی۔ عربی زبان میں عظیم اور اعظم کے الفاظ کسی شے کی معنوی بڑائی اور عظمت کے اظہار کے لیے آتے ہیں جبکہ کبیر اور اکبر کے الفاظ ظاہری بڑائی اور شوکت کے لیے۔ ایسے لوگوں کے درجات اللہ کے ہاں بڑے بھی ہیں اور عظیم بھی جو اُس دور میں جان اور مال کی بازیاں کھیلیں جبکہ دین مغلوب ہو اور اُس کے لیے کام کرنا مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف ہو۔

- وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى "اور اللہ نے سب سے وعدہ کیا بڑی بھلائی کا" کے الفاظ کے ذریعے ایسے لوگوں کو بھی تسلی دی گئی جو فتح کے بعد خلوص سے مال اور جان کی قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ دین کے لیے جب بھی کوئی محنت کی جائے گی تو اُس کا اجر و ثواب ضائع نہیں ہو گا۔ البتہ جنہوں نے اسلام کا ساتھ اُس وقت دیا جب دین پامال تھا اور دین کا کوئی ساتھی نہیں تھا وہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں شامل ہیں۔ اللہ کے ہاں اُن کا مرتبہ بہت عظمتوں کا حامل ہے۔ اِس مرتبہ تک وہ لوگ ہرگز نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کو غلبہ حاصل ہونے کے بعد آئے اور قتال و انفاق کیا۔ اگر وہ حسن نیت سے آئے ہیں تو اُن کے اجر و ثواب کی بھی اللہ کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے، لیکن درجے میں وہ اُن کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے قبل دین کی نصرت کی۔ اللہ کا سب سے بہت اچھا وعدہ ہے۔ جنت سب کو ملے گی، جو پہلے آئے ان کو بھی اور جو بعد میں آئے اُن کو بھی، البتہ حسن نیت شرط ہے۔ ہاں جنت کے درجات میں بھی بہت فرق و تفاوت ہو گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ نچلے درجے والا جنتی اوپر کے درجے والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین سے آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو[1]۔

(1) صحیح مسلم، کتاب الْجَنَّةِ وَصِفَةِ نَعِيمِهَا وَأَهْلِهَا، باب تَرَاءِي أَهْلِ الْجَنَّةِ أَهْلَ الْغُرَفِ كَمَا يُرَى الْكَوْكَبُ فِي السَّمَاءِ، عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضی اللہ عنہ

- آیت کے آخر میں فرمایا وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ "اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو"۔ اِن الفاظ سے مراد یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ کس نے کس نیت کے ساتھ اور کن داخلی و خارجی مشکلات کا مقابلہ کر کے کتنا عمل کیا ہے؟ ہر انسان میں طبعی طور پر کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں جو موروثی ہوتی ہیں۔ یہ داخلی رکاوٹیں ہیں۔ پھر ماحول میں بھی کچھ دشواریاں ہوتی ہیں جو بیرونی مشکلات ہیں۔ ایک انسان کو اندرونی و بیرونی طور پر کس طرح کی مشکلات کا سامنا تھا اور اُس نے کس حد تک اِن کا مقابلہ کر کے خلوص کے ساتھ عمل کی کوشش کی، اللہ اِس سے خوب واقف ہے۔ ایک عمل کی انجام دہی کے لیے کس شخص کو کتنی جدوجہد کرنا پڑی اور کس کے لیے وہ عمل آسان تھا، سب اللہ کے علم میں ہے۔ اِن سب کے اعتبارات سے کسی بھی عمل کی قدر و قیمت کا تعین ہو گا۔ ہمارے بڑے سے بڑے کمپیوٹر کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ اِن تمام حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی معاملہ طے کر سکے۔ لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، صرف اللہ اس کے تمام پہلوؤں سے باخبر ہے۔ تمہارے اعمال کا ہر پہلو اُس کے سامنے واضح ہے۔ ہر شخص کا درجہ اللہ تعالیٰ کے اِسی کامل علم کے اعتبار سے معین ہو گا۔

آیت 11:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ... کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض؟ ... فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ ... پھر وہ دوچند کرے اُس کے لیے اِس (انفاق) کو ... وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۚ اور اُس کے لیے عزت کا صلہ ہے۔

- انفاق فی سبیل اللہ کے لیے دو مدات ہیں۔ بندوں کی احتیاج پوری کرنے کے لیے جو مال خرچ کیا جاتا ہے اُسے "صدقہ" کہا جاتا ہے اور اللہ کے دین کی تبلیغ اور غلبے کے لیے خرچ کیے جانے والے مال کو "قرضِ حسنہ"۔ دین کی خدمت کے لیے کیے جانے والے انفاق کے نتائج دنیا میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بندوں کی دلجوئی کے لیے اللہ اِس انفاق کو قرضِ حسنہ قرار دے کر یقین دہانی کرا رہا ہے کہ تمہارا خرچ کیا ہوا مال نہ صرف محفوظ ہے بلکہ اُسے بڑھا چڑھا کر لوٹایا جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ عزت والا بدلہ بھی دیا جائے گا۔ سورۃ المزمل[73] کی آخری آیت میں یہی مضمون اِس طرح بیان ہوا:

وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا

"اور اللہ کو دیتے رہو اچھا قرض اور جو کچھ تم اپنے لیے آگے بھیجو گے بھلائی میں سے اُس کو اللہ کے ہاں پاؤ گے بہتر اور اجر کے اعتبار سے عظیم"۔

سورۂ حدید کی اِس آیت میں مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کے الفاظ میں للکارنے کا انداز ہے کہ کون ہے وہ جس کا اللہ اور آخرت پر یقین اِس درجہ پر پہنچ چکا ہو کہ وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنا مال اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے لگانے کے لیے تیار ہو۔

- نوٹ کیجیے کہ یہاں اجر کے ساتھ "کریم" کی صفت آئی ہے۔ اِس سے پہلے آیت 7 میں اجر کے ساتھ "کبیر" کی صفت آئی تھی۔ یہ اجر کی دو صفات ہیں۔ ایک تو مقدار کے اعتبار سے یہ اجر بہت زیادہ ہو گا، دوسرے یہ کہ جب یہ اجر دیا جائے گا تو اِس میں عزت افزائی کا پہلو بھی ہو گا۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ "اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى"[1] کے مصداق لینے والا محسوس کرتا ہے کہ میری حیثیت کچھ کم ہوئی ہے، گری ہے، لیکن نہیں! اللہ کے طرف سے جب اجر ملے گا تو اِس میں اکرام اور اعزاز ہو گا۔ ویسے تو ہم سب رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (القصص 28 :24) "اے اللہ تو جو خیر میری جھولی میں ڈال دے میں اُس کا فقیر ہوں" کے مصداق اللہ کے دَر کے بھکاری ہیں لیکن اللہ ہمیں اجر دیتے ہوئے ہماری عزت افزائی فرمائے گا۔ یہ اللہ کا اپنے بندوں پر بہت بڑا احسان ہے۔

- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآنِ حکیم کے احکامات عمل کی نیت سے سنتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے لوگوں نے اِس کو سنا تو حضرت ابو الدحداح انصاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، ہاں، اے ابو الدحداح۔ اُنہوں نے کہا، ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔ اُنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا"۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب لَا صَدَقَةَ إِلَّا عَنْ ظَهْرِ غِنًى، عَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رضی اللہ عنہ

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اُس باغ میں کھجور کے چھ سو درخت تھے، اُسی میں ان کا گھر تھا، وہیں اُن کے بال بچے رہتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور بیوی کو پکار کر کہا "دَحداح کی ماں، نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے"۔ وہ بولیں "تم نے نفع کا سودا کیا دَحداح کے باپ" [1]۔ اِس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخلص اہلِ ایمان کا طرزِ عمل اُس وقت کیا تھا، اور اِسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ کیسا قرضِ حسنہ ہے جسے کئی گنا بڑھا کر واپس دینے اور پھر اوپر سے اجرِ کریم عطا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ یہ ہے مطلوب کہ مطالبہ آئے اور فوراً پورا کیا جائے، اللہ کی پکار سامنے آئے اور فوراً لبیک کہا جائے۔ یہ ہے وہ جذبۂ انفاق کہ جس نے ایک جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور محض تئیس (23) برس کی مختصر سی مدت میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ اللہ ہمیں بھی اپنے دین کے لیے ایسی قربانیاں دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(1) شعب الإيمان للبيهقي، كتاب الاختيار في صدقة التطوع، باب إن الله ليريد منا القرض؟، عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ

سورۃ الحدید حصّہ سوم: آیات 12 تا 15

دین کے تقاضے اور انجامِ آخرت

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ
الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۚ﴿۱۲﴾ يَوْمَ
يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا
وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ
قِبَلِهِ الْعَذَابُ ؕ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ
تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ
الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ
مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

تمہیدی نکات:

1. پچھلی آیات میں دین کے دو تقاضے بیان ہوئے تھے ایمان اور انفاق۔ اِن آیاتِ مبارکہ میں دین کے تقاضے ادا کرنے والوں کا آخرت میں حسین انجام بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد تفصیل سے دین کے تقاضوں سے پہلو تہی کرنے والوں کو منافقین قرار دے کر اُن کے برے انجام کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔

2. اِن آیات میں جو اہم ترین موضوع وارد ہوا ہے وہ ہے نفسیاتی سطح پر نفاق کے مرض کے درجہ بدرجہ شدت اختیار کرنے کی کیفیات کا بیان۔ نفسیاتی طور پر منافق کے اندر کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اور اس اعتبار سے نفاق کے کیا مدارج اور مراحل ہیں، نفاق کہاں سے شروع ہوتا ہے، پھر

اس کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا مرحلہ کیا ہے، حقیقتِ نفاق کے ضمن بیان کیا جا چکا ہے کہ ظاہری اعتبار سے نفاق کے چار درجے (stages) ہوتے ہیں۔ نفاق کا پہلا درجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی راہ میں مال اور جان کھپانے کا حکم آتا ہے تو ایسا شخص انفاقِ مال اور جہاد و قتال سے بچنے کے لیے جھوٹے بہانے شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جب محض جھوٹے بہانوں کا اعتبار نہیں رہتا تو پھر جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں اور یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ نفاق کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ دوسروں کو بھی دین کے لیے مالی و جانی قربانی دینے سے روکنے کی کوشش کرنا۔ اِس کے بعد نفاق کا چوتھا درجہ ہے اُن مخلص اہلِ ایمان کے خلاف شدید نفرت اور بغض جو اللہ کی راہ میں جان اور مال کی بازیاں لگا رہے ہوتے ہیں۔ یہ چار مدارج تو علامات ہیں جو عمل میں ظاہر ہوتی ہیں، لیکن ذہن میں اور نفسیات کے اندر جو کھچڑی پک رہی ہوتی ہے وہ کیا ہے، اور یہ علامات در حقیقت کس اندرونی مرض کا ظہور ہیں، یہ سورۂ حدید کے اِس حصے کا مرکزی مضمون ہے۔

آیت 12:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ... (اے نبی) اُس روز آپ دیکھیں گے اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں کو... يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ ... دوڑ تا ہو گا اُن کا نور اُن کے سامنے اور داہنی طرف... بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ... (کہا جائے گا) بشارت ہو تمہیں اُن باغات کی بہتی ہیں جن کے نیچے سے نہریں... خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ... ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُن (باغات) میں... ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۚ وہی ہے شاندار کامیابی۔

- اِس آیت میں میدانِ حشر کے ایک خاص مرحلے کا ذکر ہے جسے عرفِ عام میں پل صراط سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریک راستہ ہے جو جہنم کے اوپر سے گزرتا ہے۔ اِس راستہ کو طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے پاس نور یعنی روشنی ہو۔ دین کے تقاضے ادا کرنے والوں کے پاس یہ نور ہو گا اور وہ اِس کی مدد سے یہ کٹھن راستہ عبور کر کے جنت میں چلے جائیں گے۔ دین کے تقاضوں سے پہلو تہی کرنے والے اِس نور سے محروم ہوں گے اور تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا کر جہنم میں گر جائیں گے۔

- اِس آیت میں فرمایا کہ مومن مردوں اور مومن خواتین کے سامنے بھی نور ہو گا اور دائیں طرف بھی۔ سامنے کے نور سے مراد ہے ایمانِ حقیقی کا نور۔ سورۃ النور[24] کی آیت 35 کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ ایمانِ حقیقی ایک نور ہے جو نورِ فطرت اور نورِ وحی کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے اور اِس نور کا محل اور مقام قلب ہے۔ ایمانِ حقیقی کا حصول دین کا پہلا تقاضا ہے۔ چونکہ یہ ایمان دل میں ہوتا ہے لہٰذا اِس کا نور انسان کے سامنے ہو گا۔ دوسرا نور ہے نورِ اعمال۔ نیک انسان کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ہو گا لہٰذا یہ نور انسان کے دائیں طرف ہو گا۔ ہر عمل کے اندر یا کوئی نورانیت ہے یا ظلمانیت۔ ہماری بصارتِ ظاہری اِس کا ادراک نہیں کر پاتی۔ جب انسان اچھا یا برا عمل کرتا ہے تو اُس عمل کی نورانیت یا ظلمانیت کو اپنی شخصیت میں جذب کرتا ہے۔ روزِ قیامت اِسی کا ظہور ہو گا کیونکہ اُس روز ہر شے کی اصل حقیقت سامنے آجائے گی۔

- یہ مضمون اِس سے قبل سورۃ التحریم[66] کی آیت 8 میں بھی آچکا ہے:

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"اُن کا نُور اُن کے سامنے اور داہنی طرف روشنی کرتا ہوا چل رہا ہو گا اور وہ التجا کریں گے اے ہمارے رب! ہمارے لیے پورا فرما دے ہمارے نور کو اور ہمیں معاف فرما بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "کسی کا نور اتنا تیز ہو گا کہ مدینہ سے عدن تک کی مسافت کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہو گا اور کسی کا نور مدینہ سے صنعاء تک اور کسی کا اِس سے کم یہاں تک کہ کوئی مومن ایسا بھی ہو گا کہ جس کا نور اُس کے قدموں سے آگے نہ بڑھے گا"[1]۔ اِسی لیے سورۂ تحریم کی اِس آیت میں ذکر کیا گیا کہ اہلِ ایمان اللہ سے اپنے نور کے اضافے کے لیے دعا کریں گے اور اُن گناہوں پر بخشش مانگیں گے جن کے اثرات نے اُن کے نور کو دھندلا کر دیا۔ اللہ ہر

(1) تفسیر الطبری، تفسیر سورۃ الحدید آیت 12

شے پر قادر ہے اور اُسے اختیار ہے کہ اپنے فضل و کرم سے گناہوں سے درگزر فرما کر نور میں کمی کی تلافی فرما دے۔

- اِس آیت میں مومن مردوں اور مومن خواتین کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا گیا۔ اگلی آیت میں نفاق کے ضمن میں بھی یہی اسلوب ہے۔ گویا یہاں خواتین کے علیحدہ تشخص اور اُن کی ذاتی اخلاقی ذمہ داریوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ روزِ قیامت ہر مرد کو اپنا حساب دینا ہو گا اور ہر خاتون کو اپنا۔ شوہر خواہ کتنا نیک ہو، اپنی بیوی کے کام نہیں آ سکتا اور بیوی خواہ کتنی نیک ہو، شوہر کو نہیں بچا سکتی۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء 4: 34) "مرد عورتوں پر حاکم و نگہبان ہیں" کی روشنی میں خواتین دنیا میں بیوی کی حیثیت میں تو شوہر کے تابع ہیں لیکن روزِ قیامت بیوی، شوہر کے تابع نہ ہو گی اور اِس کا حساب بالکل علیحدہ حیثیت میں ہو گا۔

- اِس آیت میں مزید فرمایا کہ جب مومن مرد اور خواتین پل صراط کے کٹھن مرحلے کو طے کر رہے ہوں گے تو اُنہیں خوشخبری دی جائے گی کہ تمہاری محنت اور مشقت کا دور ختم ہوا۔ امتحان اور آزمائش کے مرحلے سے تم گزر آئے ہو۔ اب تمہارے لیے وہ باغات ہیں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں۔ اِن باغات میں تم ہمیشہ ہمیش رہو گے اور یہی ہے سب سے بڑی اور عظیم کامیابی۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ میں هُوَ کی ضمیر حصر کا مضمون پیدا کر رہی ہے یعنی اصل کامیابی یہی ہے۔ مقابلہ کرنے والوں کو چاہیے کہ اِس کامیابی کے حصول کے لیے مقابلہ کریں۔ سورۃ المطففین[83] آیت 26 کے مطابق وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ "چاہیے کہ آگے نکلنے والے اِس معاملہ میں ایک دوسرے سے آگے نکلیں"۔ یہ نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم مسئلہ ہے۔ جو شخص دین کی کسی خدمت کا بیڑا اٹھائے اُس پر یہ بات پوری طرح واضح ہونی چاہیے کہ اُس کا نصب العین سوائے آخرت کی فلاح اور اللہ کی رضا کے کوئی نہ ہو۔ کوئی اور شے اُس کی نظر میں نصب العین کا درجہ اختیار نہ کر لے۔ وہ دنیوی نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنے دین کے تقاضے ادا کرتا رہے اور اِسی طرزِ عمل سے وہ کامیابی کی اصل منزل کو حاصل کر لے گا۔

آیت 13:

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا ... اُس روز کہیں گے منافق مرد اور عورتیں ایمان والوں سے ... انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ... ہمارا انتظار کرو تا کہ ہم لے لیں تمہارے نور میں سے کچھ حصہ ... قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ... کہا جائے گا لوٹ جاؤ اپنے پیچھے (دنیا میں) اور تلاش کرو نور ... فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ... پھر حائل کر دی جائے گی اُن کے درمیان ایک دیوار جس میں ہو گا ایک دروازہ ... بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ اُس (دیوار) کی اندرونی جانب رحمت ہو گی اور اُس کے سامنے باہر کی جانب عذاب ہو گا۔

- اِس آیت میں روزِ قیامت پلِ صراط پر اُن لوگوں کی بے بسی اور انجامِ بد کا بیان ہے جنہوں نے دنیا میں دین کے تقاضوں سے پہلو تہی کی۔ ایسے لوگ منافق قرار پائیں گے، نورِ ایمان و نورِ اعمال سے محروم ہوں گے اور اندھیروں میں ٹھوکریں کھائیں گے۔

- بے بسی کے عالم میں منافق مرد اور منافق خواتین اہلِ ایمان کو پکار کر کہیں گے کہ کہاں آگے بڑھے چلے جا رہے ہو، ہمارے پاس کوئی روشنی نہیں ہے، ذرا ٹھہرو، رکو تا کہ ہم بھی تمہارے نور سے استفادہ کر لیں۔ اہلِ ایمان خود اُس کٹھن مرحلے کو عبور کرنے کی فکر میں ہوں گے لہٰذا وہ منافقین کو کوئی جواب نہ دیں گے۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

> حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اُنہیں ایک دفعہ دوزخ کا خیال آیا، اور وہ رونے لگیں، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، تمہیں کس چیز نے رلایا؟ عرض کیا، مجھے دوزخ یاد آئی، اور اُسی کے خوف نے مجھے رلایا ہے، تو کیا آپ قیامت کے دن اپنے گھر والوں کو یاد رکھیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تین جگہ تو کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا (اور کسی کی خبر نہیں لے گا) ایک وزنِ اعمال کے وقت، جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو جائے، کہ اُس کے اعمال کا وزن ہلکا ہے یا بھاری، اور دوسرے اعمالناموں کے ملنے کے وقت جبکہ مردِ مومن اپنے داہنے ہاتھ میں اپنا اعمال نامہ پا کر خوشی خوشی دوسرے سے کہے گا، کہ پڑھو میرا اعمال نامہ، یہاں تک کہ معلوم ہو جائے، کہ کس ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس کا

اعمال نامہ، آیا داہنے ہاتھ میں یا پیچھے کی جانب سے بائیں ہاتھ میں، اور تیسرے پل صراط پر جبکہ وہ رکھا جائے گا جہنم کے اوپر (اور حکم دیا جائے گا سب کو اُس پر سے گزرنے کا)"۔[1]

مومنین تو منافقین کی فریاد کا جواب نہ دیں گے لیکن اللہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا منافقین سے کہے گا کہ لوٹ جاؤ اپنے پیچھے کی جانب اور تلاش کرو نور۔ یہاں ترجمانی کرنی پڑے گی کہ اگر ممکن ہے تو دنیا میں واپس جاؤ اور وہاں سے نور حاصل کر کے لاؤ۔ یہ نور دنیا کی زندگی ہی سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ روزِ قیامت کسی کا دوبارہ دنیا میں آنا ناممکن ہو گا لہٰذا یہ الفاظ کہ اگر لوٹ سکتے ہو تو لوٹ جاؤ پیچھے کی جانب، منافقین کی حسرتوں میں اور اضافہ کریں گے۔

- اِس آیت میں مزید فرمایا کہ پھر مومنوں اور منافقوں کے درمیان ایک فصیل حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا۔ اِس فصیل کے اندر کی جانب رحمتِ خداوندی ہو گی اور بیرونی جانب عذاب۔ گویا یہ فصیل جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہے۔ اِس فصیل میں دروازہ اُن گناہ گار مسلمانوں کو جہنم سے نکالنے کے لیے ہے جو صدقِ دل سے ایمان تو لائے تھے لیکن اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق قرار پائے۔ یہ مسلمان اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد اِس دروازے کے ذریعے جہنم سے نکال دیے جائیں گے۔ اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں ایمان کی کچھ رمق بھی ہو گی وہ اپنے گناہوں کی سزا پا کر بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ جہنم میں خُلود صرف ان کے لیے ہے جن کے دلوں میں سرے سے ایمان کی کوئی رمق نہیں ہو گی۔ البتہ بعض بے عمل مسلمان کہہ دیتے ہیں چلو کچھ عرصہ جہنم میں سزا پانے کے بعد جنت میں چلے جائیں گے۔ یہ سوچ انتہائی غلط ہے۔ سورۃ الفرقان[25] آیت 66 میں فرمایا گیا:

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا

"بے شک جہنم بری جگہ ہے مستقل رہنے کے اعتبار سے اور عارضی رہنے کے اعتبار سے بھی"۔

جہنم بہت بری جگہ ہے اور وہ عارضی طور پر داخل ہونے والے کو بھی اپنی پوری ہولناکی دکھادے گی۔ اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ۔ آمین!

---

(1) سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فِيْ ذِكْرِ الْمِيْزَانِ، عَنْ عائشۃ رضی اللہ عنہا

آیت 14:

يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ ... وہ (منافقین) پکاریں گے اُن (اہل ایمان) کو کیا ہم (دنیا میں) تمہارے ساتھ نہ تھے؟... قَالُوْا بَلٰى ... وہ (مسلمان) جواب دیں گے کیوں نہیں!... وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ... اور لیکن تم نے خود کو (دنیا کی محبت کے) فتنہ میں ڈالا... وَ تَرَبَّصْتُمْ ... اور تم (ہمارے احکامات پر عمل کے حوالے سے) تاخیر کرتے رہے... وَ ارْتَبْتُمْ ... اور تم (جزا و سزا کے حوالے سے) شک میں پڑ گئے ... وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ ... اور تمہیں کچھ خوش کن خواہشات نے دھوکے میں ڈال دیا... حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ ... یہاں تک کہ اللہ کا حکم (تمہاری موت کا فیصلہ) آپہنچا... وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ اور اللہ کے بارے میں تمہیں ایک بڑے دغاباز (شیطان) نے دھوکہ دیا۔

- اِس آیت میں فرمایا کہ منافقین جہنم میں گرنے کے بعد چیخ چیخ کر مومنوں کو پکاریں گے کہ کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ نہ تھے؟ مومنین اب محفوظ مقام پر پہنچ چکے ہوں گے لہٰذا جواب دیں گے کیوں نہیں! ہمارے تمہارے درمیان والدین اور اولاد کا یا شوہر اور بیوی کا یا بہن بھائی کا یا باہم دوستی کا یا کوئی اور تعلق تھا لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کیا، تم گومگو کی کیفیت میں انتظار کرتے رہے، تم شکوک و شبہات میں پڑ گئے، تمہیں تمہاری خوش کن خواہشات نے دھوکے میں ڈالا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ یعنی تمہاری موت کا وقت آگیا۔ درحقیقت تمہیں ایک بہت بڑے دھوکہ باز یعنی شیطان نے اللہ کے حوالے سے فریب میں مبتلا کیا۔

- اِس آیت میں ایک مومن کے باطنی اعتبار سے درجہ بدرجہ منافق بن جانے کے چار مراحل کا ذکر ہے:

  i. اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کرنا۔
  ii. دین کے تقاضے ادا کرنے کے حوالے سے گومگو کا شکار ہو جانا۔
  iii. ذہن میں شکوک و شبہات کا گھر کر لینا۔
  iv. خود ساختہ خوش کن خواہشات کے دھوکہ میں آکر دین کے تقاضوں سے غفلت برتنا۔

نفاق کا پہلا مرحلہ:

اپنے آپ کو فتنہ میں ڈالنا نفاق کا پہلا مرحلہ ہے۔ سورۃ التغابن[64] آیت 15 میں فتنہ کی وضاحت اس طرح بیان ہوئی:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ

"بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو فتنہ یعنی آزمائش کا ذریعہ ہیں"۔

مال اور اولاد کی محبت انسان کے اندر رچی بسی ہوتی ہے۔ انسان اگر اِس محبت سے اتنا مغلوب ہو جائے کہ اُسے شریعت کے احکامات کا پاس ہی نہ رہے اور وہ اپنی دینی ذمہ داریوں سے غافل ہو جائے تو یہ محبت فتنہ ہے۔ مال و اولاد کی محبت فتنہ ہے اگر یہ اللہ، اُس کے رسول ﷺ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی محبت سے قوی تر ہو جائے۔ سورۃ التوبۃ[9] کی آیت نمبر 24 کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیں:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اِ۟قْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

"کہہ دیجیے (اے نبی ﷺ) اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں خسارے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں، اگر تمہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ اپنا فیصلہ (یعنی تمہاری موت) اور اللہ ایسے نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا"۔

مال اور اولاد کو Asset یعنی سرمایہ نہیں بلکہ Liabilities یعنی ایسی امانتیں سمجھنا چاہیے جن کے بارے میں روزِ قیامت باز پرس ہو گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (الکہف[18]:46)

"مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق و) زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں (وہ) ہیں جو بہتر ہیں تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے اور امید لگانے کے اعتبار سے"۔

گویا نفاق کا پہلا مرحلہ ہے مال و اولاد کی محبت میں اِس قدر کھو جانا کہ اللہ کے احکامات اور آخرت کی تیاری کی فکر ہی نہ رہے۔

نفاق کا دوسرا مرحلہ:

دین کے تقاضوں کی ادائیگی کے حوالے سے گومگو کا شکار ہونا۔ اپنے آپ کو مال اور اولاد کے فتنے میں ڈالنے کا نتیجہ نکلتا ہے تربص یعنی گومگو کی صورت۔ ایک ہے وہ کیفیت کہ جب دین کے تقاضے واضح ہو گئے تو اب یکسوئی کے ساتھ منجدھار میں کود پڑنا۔ ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم۔ اب جو ہو سو ہو ہم نے تو اپنی کشتی پانی میں ڈال دی ہے۔ بقولِ فیض:

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

ایک ہے گومگو یعنی انتظار کی کیفیت اور فیصلہ نہ کر سکنا کہ چلوں یا نہ چلوں۔ انسان سوچ میں پڑ جائے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے اور کہیں ویسا نہ ہو جائے! فیصلہ کن اقدام کی صلاحیت انسان میں باقی نہ رہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھائے اور ایک پیچھے ہٹا لے۔ آگے بڑھنے کو بھی جی چاہے لیکن پھر خطرات، آزمائشوں اور قربانیوں کے تقاضے کو دیکھ کر انسان کی ہمت جواب دے جائے اور اُس کا جذبۂ عمل سرد پڑ جائے۔ بقولِ غالب:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

یہ شیطان کے حربوں میں سے ہے کہ اگر انسان کسی دینی تقاضے کی ادائیگی کے لیے تیار ہو جائے تو وہ انسان کو تاخیر کی پٹی پڑھاتا ہے تاکہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ انسان کا جذبۂ عمل ٹھنڈا ہو جائے۔

نفاق کا تیسرا مرحلہ:

انسان کا ذہن شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جائے۔ تربص کا نتیجہ ہے شکوک و شبہات میں پڑ جانا۔ انسان کے پاس جو کوئی تھوڑی بہت پونجی ایمان اور یقین کی ہوتی ہے وہ گومگو کی کیفیت کی وجہ سے زائل ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن ایک دوسرے سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر اس کا باطن اس کے خارج پر عکس ڈالتا ہے تو اس کے خارج سے اس کا باطن بھی متاثر ہوتا ہے۔ اگر انسان کے دل میں یقین کی دولت ہے اور وہ ہمت کر کے آگے بڑھتا ہے تو اِس کے عمل کے ذریعے اُس کے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس اگر انسان کم ہمتی کی وجہ سے تربص یعنی گومگو کا شکار ہے تو جو تھوڑی بہت پونجی ایمان و یقین کی تھی وہ بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ سورۃ المنافقون[63] کی آیت 3 میں اِس صورتِ حال کا نقشہ یوں کھینچا گیا:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ

"یہ اِس لیے کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے تو اُن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی سو اب یہ سمجھتے ہی نہیں"۔

جب دل پر مہر لگ جائے تو انسان دین اور دینی تقاضوں کے صحیح تصور کا فہم حاصل کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ شکوک و شبہات کے تحت سوچتا ہے کہ ہم اپنا سب کچھ یہاں کھپا دیں اور معلوم نہیں کہ اس کا کچھ بدلہ بھی ملے گا یا نہیں! پتہ نہیں آخرت ہو گی بھی یا نہیں۔ اِس لیے کہ یہ سارا ادھار کا سودا ہے۔ سورۃ التوبۃ[9] آیت 111 میں فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

"اہلِ ایمان سے اللہ نے اُن کے مال اور جانیں خرید لیے ہیں جنت کے عوض"۔

جنت تو ملے گی آخرت میں، یہاں تو نہیں ملے گی۔ یہ تو ادھار کا سودا ہے اور ادھار کے سودے پر آدمی کچھ نہ کچھ تو متردّد ہوتا ہے۔ اگر نقد سودا ہو تو ٹھیک ہے کہ ہاتھ سے ایک چیز دی اور دوسری لے لی لیکن یہ تو ادھار کا سودا ہے۔ یہ ہے نفاق کا تیسرا مرحلہ جس کی وجہ سے ایمان کی پونجی برف کی طرح پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔

نفاق کا چوتھا مرحلہ:

خود ساختہ خوش کن خواہشات کے فریب میں آکر دینی تقاضوں کی ادائیگی سے غافل ہو جانا۔ وہ انسان جو آخرت کو مانتا ہو لیکن جرأتِ عمل سے محروم ہو وہ خود کو آخرت میں کامیابی کے اعتبار سے مطمئن کرنے کے لیے کچھ من پسند خواہشات وضع کرتا ہے۔ یہ خواہشات انسان کے ذہن پر اس درجہ حاوی ہو جاتی ہیں کہ وہ اب انہی کے حوالے سے سوچتا ہے اور رفتہ رفتہ ان خواہشات کا تانہ بانہ ایک نظریے اور عقیدے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان خود ساختہ اور خوش کن خواہشات کو قرآن "امانی" کہتا ہے۔ انگریزی میں ان کے لیے wishfull thinkings کے الفاظ آتے ہیں۔

کوئی بھی امت مسلمہ جب بگڑتی ہے اور اپنے مقام سے گرتی ہے تو لازماً کچھ "امانی" کا سہارا لیتی ہے۔ اہل کتاب آخرت کو اور آخرت میں حساب کتاب ہونے کو برحق سمجھتے تھے۔ البتہ جب وہ اپنے عمل کو دیکھتے تھے تو احساس ہوتا تھا کہ باعتبار عدل آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ اب اس مسئلے کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ کچھ دلفریب خواہشات کو عقیدے کا درجہ دے دیا۔ ان خواہشات میں شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ، اللہ کی محبوب قوم ہونے کا عقیدہ "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدۃ5: 18)" جنت کا اپنے ہی لیے مخصوص ہونے کا دعویٰ "لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (البقرۃ2: 111)" اور اپنے بخشے بخشائے ہونے کا خیال "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرۃ2: 80)" شامل ہیں۔ ان من گھڑت خواہشات کے نتیجے میں اہل کتاب کا عقیدہ یہ بن گیا تھا کہ اوّل تو ہمارے جہنم میں داخل ہونے کا امکان ہی نہیں ہے، ہم اللہ کے بڑے چہیتے اور لاڈلے ہیں، ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، کئی نبی ہم میں سے آئے اور کئی کتابیں ہماری طرف نازل کی گئیں۔ اگر بفرضِ محال لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ہمیں جہنم میں ڈالا بھی گیا تو یہ بھی صرف چند دن کے لیے ہو گا اور جلد وہاں سے نکال لیا جائے گا۔ قرآنِ حکیم نے متعدد بار ان من گھڑت خواہشات کی بڑی شدت سے نفی کی:

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرۃ2: 111)

"اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے

گا۔ یہ ان لوگوں کی خواہشات ہیں۔ (اے نبی) کہہ دیجیے کہ اگر سچے ہو تو دلیل پیش کرو"۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ2:80)

"اور وہ کہتے ہیں کہ (دوزخ کی) آگ ہمیں ہر گز نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند روز۔ (اے نبی ﷺ) اُن سے پوچھیے کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے رکھا ہے کہ اللہ جس کے خلاف نہ کرے گا یا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں علم ہی نہیں"۔

قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (آل عمران3:24)

"وہ کہتے ہیں کہ (دوزخ کی) آگ ہمیں نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند روز اور اُنہیں دھوکے میں ڈال دیا اُن کے دین کے بارے میں اُس جھوٹ نے جو وہ گھڑ رہے ہیں"۔

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (المائدۃ5:18)

"(اے نبی ﷺ) اُن سے پوچھیے اللہ تمہیں تمہارے گناہوں کی وجہ سے عذاب کیوں دیتا ہے"۔

آج یہ گمراہی ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ مَا أَتٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ (۱)

"میری اُمت پر بھی لازماً وہی حالات آکر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے اسی طرح جیسے ایک جوتی دوسری جوتی کے مشابہ ہوتی ہے"۔

بنو اسرائیل کی طرح ہم بھی اپنی بے عملی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں لیکن اِس کے وبال سے بچنے کے لیے کچھ پر امید لیکن بے سند خواہشات کا سہارا لے کر خود کو جھوٹی تسلی دیتے رہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے دامن سے وابستہ ہیں، ہم بہر حال امت مرحومہ میں شامل ہیں اور جہنم تو صرف کفار کے لیے بنائی گئی ہے:

خوار ہیں بد کار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں مولا تیرے محبوب کی امت میں ہیں

(۱) سنن الترمذی، کتاب الایمان، باب مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رضی اللہ عنہ

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء 4 آیات 123-124 میں واضح فرمادیا کہ:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾

"نہ تمہاری خواہشات سے کچھ ہو گا اور نہ ہی اہلِ کتاب کی خواہشات سے۔ جس نے برائی کی وہ اُس کی سزا پائے گا اور اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست یا مددگار نہ پائے گا۔ اور جس نے اچھا عمل کیا خواہ مرد ہوں یا عورت بشرطیکہ مومن ہوں تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کے ساتھ تل برابر بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی"۔

یہ ہے نفاق کا چوتھا مرحلہ کہ جس کی وضاحت اِن الفاظ میں آئی کہ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ "تمہیں دھوکہ دیئے رکھا تمہاری کچھ من گھڑت خواہشات نے"۔

- آیت کے اگلے حصے میں فرمایا گیا حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ "یہاں تک کہ اللہ کا حکم آپہنچا"۔ یہاں اللہ کے حکم سے مراد ہے انسان کی موت کا فیصلہ۔ اگر موت سے پہلے پہلے انسان کو اپنی غفلت کا احساس ہو جائے اور وہ سچی توبہ کر لے تو اللہ تمام خطاؤں کو معاف فرما دیتا ہے۔ منافقین روزِ قیامت انجامِ بد سے اس لیے دوچار ہوں گے کہ اُنہوں نے موت کا حکم آنے سے پہلے توبہ نہیں کی۔

- آیت کے آخر میں فرمایا گیا وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ "اور اللہ کے بارے میں تمہیں ایک بڑے دغاباز نے دھوکہ دیا"۔ "غُرُوْر" کے معنی ہوتے ہیں دھوکہ یا فریب اور "غَرُوْر" کا مفہوم ہے بہت ہی دھوکہ دینے والا یعنی بڑا دھوکے باز۔ اِس سے مراد ہے شیطان۔ یہاں زیادہ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دیا شیطان نے۔ اللہ کے بارے میں دھوکہ دینا یہ ہے کہ شیطان اللہ کی صرف شانِ رحمت کو انسان کے سامنے کر دیتا ہے جس کے سہارے انسان گناہ پر گناہ کرتا رہتا ہے:

سو سو گناہ کیے تیری رحمت کے زور پر

انسان بے عملی کے باوجود اِس تصور پر خود کو تسلی دیتا رہتا ہے کہ اللہ بڑا رحیم ہے، بڑا کریم ہے، بڑا ودود ہے، نکتہ نواز ہے اور بخشنے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ اللہ انسان سے اُس کی ماں سے بڑھ

کر محبت کرتا ہے۔ کیا ماں پسند کرے گی کہ اُس کا بچہ آگ میں جلے؟ اِسی طرح اللہ بھی اپنے بندوں کو آگ میں جلنے نہیں دے گا۔ اُسے اپنی تخلیق سے پیار ہے، وہ کیسے اِسے آگ میں جھونک دے گا۔ قرآن میں جہنم کا ذکر صرف ڈراوے کے لیے ہے تاکہ انسان بالکل ہی بے قابو نہ ہو جائے، بقولِ شاعر:

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارہ نہ کیا　　پر تُو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر　　پر تری رحمت نے گوارا نہ کیا

اللہ کے بارے میں متوازن عقیدہ یہ ہے کہ وہ رحیم بھی ہے لیکن عادل بھی، غفور بھی ہے لیکن سریع الحساب بھی، ودود بھی ہے لیکن عزیزٌ ذوانتقام بھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

(الحجر 15:49-50)

"(اے نبی ﷺ) میرے بندوں کو بتا دیجیے کہ میں بڑا بخشنے والا (اور) مہربان ہوں اور یہ کہ میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے"۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (المائدۃ 5:98)

"جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے اور یہ کہ اللہ بخشنے والا مہربان بھی ہے"۔

شیطان اللہ کی صرف شانِ رحمت کو انسان کے سامنے اِس طرح مزین کرتا ہے کہ انسان اللہ کی شانِ قہاری سے غافل ہو کر مسلسل بے عملی کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ یہ ہے شیطان کا فریب اللہ کے حوالے سے۔ اللہ نے ہمیں خبردار فرمایا:

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (لقمان 31:33، فاطر 35:5)

"پس دنیا کی زندگی تم کو دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ بہت زیادہ دھوکہ دینے والا (شیطان) تمہیں اللہ کے بارے میں کسی طرح کا دھوکہ دے"۔

اللہ کی صرف شانِ رحمت ہی کو بیان کر کے انسان اللہ کی تحسین نہیں بلکہ جزا و سزا کے تصور کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔ گویا اُس کا خیال یہ ہے کہ نیکی کرنے والے اور برائی کرنے والے سب ہی

اللہ کی رحمت سے بخشے جائیں گے۔ اللہ نے قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر اس گمراہی کی نفی کی ہے:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝

(القلم 68:35-36)

"کیا ہم فرمانبرداروں کو برابر کر دیں گے نافرمانوں کے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے فیصلے کرتے ہو؟"

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (ص 38:28)

"کیا ہم اُن کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے برابر کر دیں گے اُن کے جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا متقین کو برابر کر دیں گے بدکاروں کے؟"

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (الجاثیۃ 45:21)

"جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اُن لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور اُن کی زندگی اور موت یکساں ہوں گے؟ برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں"۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝ وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝ (الانفطار 82:6-14)

"اے انسان تجھے اپنے شفیق پروردگار کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا؟ (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا اور (تیرے وجود کو) معتدل رکھا۔ جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔ مگر تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو، حالانکہ بلاشبہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ عالی قدر لکھنے والے (تمہارے اعمال کے)۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔ بیشک نیکوکار نعمتوں میں ہوں گے اور بدکردار دوزخ میں"۔

آیت 15:

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ ... پس (اے منافقو!) آج تم سے کوئی فدیہ قبول نہ کیا جائے گا...
وَّ لَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ... اور نہ ہی اُن سے جنہوں نے کفر کیا... مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ... تمہارا ٹھکانہ آگ ہے... هِيَ مَوْلٰىكُمْ ... وہی تمہاری ساتھی ہے... وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ اور وہ لوٹنے کی بہت بری جگہ ہے۔

- اِس آیت میں خبردار کر دیا گیا کہ دنیا میں منافقین مسلمانوں کے ساتھ ہیں لیکن آخرت میں اُن کا انجام کافروں کے ساتھ ہو گا۔ سورۃ النساء[4] میں یہ مضمون اِس طرح بیان ہوا:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (النساء[4]:140)

"بے شک اللہ منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں اکٹھا کرنے والا ہے"۔

دنیا میں مجرم جرمانہ دے کر آزاد ہو جاتے ہیں لیکن روزِ قیامت منافقین اور کفار سے کوئی فدیہ قبول نہ کیا جائے گا۔

- آیت کے اگلے حصے میں فرمایا کہ اے کافرو اور منافقو! آج تمہارا ماویٰ یعنی ٹھکانہ آگ ہے۔ ماویٰ کہتے ہیں ایسی پناہ گاہ کو جس کی طرف انسان خطرات سے بچنے کے لیے لپکتا ہے۔ طنزیہ اسلوب میں کہا گیا کہ اب تمہاری پناہ گاہ آگ ہے۔ مزید طنز کرتے ہوئے حسرت میں اضافہ کیا گیا کہ یہ آگ ہی تمہاری مولا ہے۔ مولا کہتے ہیں ایسے قابلِ اعتماد ساتھی کو جس سے انسان اپنا دکھ درد بانٹ سکے۔ فرمایا تمہاری ہمدرد، غم گسار، دمساز اور رفیق اب آگ ہے۔ جو شکوہ و فریاد کرنی ہے اِسی سے کرو۔ یہ آگ ہی تمہارا اوڑھنا اور بچھونا ہے اور یہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

سورۃ الحدید حصّہ چہارم: آیات 16 تا 19

قربِ الٰہی کے حصول کا راستہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ
فٰسِقُوْنَ ⑯ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ
تَعْقِلُوْنَ ⑰ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ
لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ⑱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَالشُّهَدَآءُ
عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَحِيْمِ ⑲

سورۂ حدید کے تیسرے حصے میں دین کے تقاضوں سے پہلو تہی کا نتیجہ نفاق بیان ہوا اور نفاق کے برے انجام کا ذکر لرزا دینے والے اسلوب میں ہوا۔ اب سورۂ حدید کے اِس چوتھے حصے میں بڑے جھنجھوڑ دینے والے انداز میں اپنے باطن میں جھانکنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آخرت کے ہلا دینے والے حقائق سامنے آنے کے باوجود بھی اگر انسان دینی تقاضوں کی ادائیگی کی طرف مائل نہیں ہو رہا تو وہ اپنے باطن کا جائزہ لے کہ کہیں دل کی سختی اُس انتہا تک تو نہیں پہنچ گئی کہ وہ رفتہ رفتہ انسان کو فاسق بنا دے۔ اِس کے بعد ہمت بندھانے کے انداز میں فرمایا گیا اگر دل کی دنیا اجڑی ہوئی ہے تب بھی مایوس نہ ہو، اصلاحِ حال کا امکان ہے۔ پھر اصلاحِ حال کے لیے عملی راہ نمائی بیان کی گئی ہے۔

آیت 16:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ... کیا اب بھی وقت نہیں آیا مومنوں کے لیے ... اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ ... کہ جھک جائیں اُن کے دل اللہ کی یاد سے ... وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ ... اور اُس سے

جو نازل ہوا ہے حق میں سے... وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ... اور وہ نہ ہو جائیں اُن کی طرح جن کو کتابیں دی گئی تھیں اِس سے پہلے... فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ... پھر اُن پر زمانہ طویل گزر گیا (غفلت میں)... فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ... تو سخت ہو گئے اُن کے دل... وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿١٦﴾ اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

- اِس آیت میں اہلِ ایمان کے لیے جھنجھوڑنے کے انداز میں ایک نفسیاتی اپیل ہے۔ اُن سے فرمایا گیا کہ تمہارے سامنے دین کے تقاضے بھی آ گئے، تقاضے ادا کرنے والوں کا حسین انجام بھی آ گیا اور تقاضوں کی ادائیگی سے گریز کرنے والوں کے برے انجام کا نقشہ بھی آ گیا۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تمہارے دلوں میں رقت پیدا ہو اور وہ اللہ کی یاد اور اُس کی فرمانبرداری کی طرف مائل ہو جائیں۔ سوچو کس وقت کا انتظار کر رہے ہو؟ کس دلیل کے منتظر ہو؟ تمہارے دل کیوں نہیں جھک رہے اللہ کے احکامات کی بجا آوری کے لیے؟ تم ایمان و انفاق کے تقاضے پورے کرنے پر کیوں آمادہ نہیں ہو رہے؟

- شیطان کے حربوں میں سے ایک حربہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان سے نیکی کے معاملے میں تاخیر کراتا ہے۔ انسان پر دین کے مطالبات واضح ہو جاتے ہیں لیکن شیطان کچھ دنیوی معاملات کی انجام دہی تک دین کے تقاضوں کی ادائیگی کو مؤخر کرنے کی پٹی پڑھاتا ہے۔ ابھی اولاد کی تعلیمی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاؤ، ابھی ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں، ابھی ذرا مکان کی تعمیر مکمل ہو جائے، اِس کے بعد خود کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دینا۔ اِسی لیت و لعل میں وقت گزرتا رہتا ہے، دنیا کے معاملات ختم نہیں ہوتے:

ہزاروں خواہشیں ایسی، کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

اپنی خواہشات کی تکمیل کے انتظار میں انسان دینی تقاضوں سے مسلسل گریز کرتے کرتے نفاق کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے۔ قرآن کی روشنی میں دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہونے کے باوجود پوری پوری زندگیاں تاخیر و تعویق کی وجہ سے غفلت میں بیت جاتی ہیں اور انسان کی مہلتِ عمر ختم ہو جاتی ہے۔ اِس محرومی سے بچانے کے لیے للکارا گیا کہ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا

اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ "کیا وقت آنہیں گیا کہ اہلِ ایمان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد اور اُس حق کے لیے جو نازل ہو چکا ہے؟" آخر کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا یقین ہے کہ ابھی زندگی باقی ہے؟ کیا کہیں سے تمہارے پاس کوئی ضمانت ہے کہ ابھی تمہارے پاس کچھ مہلتِ عمل موجود ہے؟

- یہ بات اِس سے قبل بیان کی جا چکی ہے کہ مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں میں اہلِ کتاب کا ذکر بطورِ عبرت آیا ہے۔ اہلِ کتاب مسلمانوں سے قبل امت کے منصب پر فائز تھے لیکن اُن میں بعض ایسی اعتقادی اور عملی گمراہیاں آ گئیں جن کی وجہ سے اللہ اُن سے ناراض ہو گیا۔ قرآنِ حکیم میں یہ حقیقت کئی بار بیان کی گئی کہ اہلِ کتاب دینِ حق اور اِس کے تقاضوں کا علم رکھتے تھے لیکن اُنہوں نے جان بوجھ کر اختلاف کیا:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (آل عمران 3:19)

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور اہلِ کتاب نے (اِس دین سے) اختلاف نہیں کیا مگر علم حاصل ہونے کے بعد آپس کی ضد کی وجہ سے"۔

اہلِ کتاب کے اِس اعراض کو جب ایک طویل مدت بیت گئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ خَطِيئَةً نُكِتَتْ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ سُقِلَ قَلْبُهُ وَإِنْ عَادَ زِيدَ فِيهَا حَتَّى تَعْلُوَ قَلْبَهُ وَهُوَ الرَّانُ الَّذِي ذَكَرَ اللّٰهُ "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ"(۱)

"بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو وہ سیاہی دور کر دی جاتی ہے اور اگر توبہ کے بجائے گناہ پر گناہ کیے جاتا ہے تو وہ سیاہی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ اُس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے، یہی رَین (زنگ) ہے جس کا ذکر

(۱) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب وَمِنْ سُورَةِ وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ، عَنْ ابی هريرة رضی اللہ عنہ

اللہ نے کہا كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ "ہر گز نہیں بلکہ اُن کے دلوں پر زنگ آگیا ہے اُن کی بری کمائی کی وجہ سے "(المطففین 83:14)"۔

چونکہ ایمانِ حقیقی کا محل قلب ہے۔ یہ دل کی سختی در حقیقت ایمان کے نور سے محروم ہو جانے کی کیفیت کا بیان ہے۔ سورۃ البقرۃ 2 آیت 74 میں اہلِ کتاب کے دلوں کی سختی کا نقشہ اِس طرح کھینچا گیا:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

"پھر اِس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور اُن میں سے پانی بہنے لگتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے"۔

اِسی قساوتِ قلبی کا منظر آج اُمت مسلمہ پیش کر رہی ہے۔ قرآنِ حکیم اور نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جد وجہد کے ذریعے ہم پر بھی دین کا جامع تصور اور دینی تقاضے واضح ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی ہم عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ در حقیقت نتیجہ ہے اُس قساوتِ قلبی یعنی دل کی سختی کا جس کا ذکر اِس آیت میں کیا گیا۔ یہ قساوتِ قلبی انتہائی مہلک ہے کیونکہ اِسی کی وجہ سے انسان آخر کار فاسق بن جاتا ہے جیسا کہ اِس آیت میں اہلِ کتاب کے بارے میں آگاہ کیا گیا کہ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ "اور اُن میں سے اکثر فاسق ہیں"۔ سورۃ التوبۃ 9 آیت 24 میں فاسق ایسے لوگوں کو کہا گیا جو مرغوباتِ دنیا کی محبتوں کو دینی محبتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ فاسق اللہ کے باغی کو کہتے ہیں کیونکہ فسق سے مراد ہے اللہ کے حکم کو توڑنا۔ یہ ایک شیطانی عمل ہے۔ فسق کا لفظ سورۃ الکھف 18 آیت 50 میں ابلیس کی اُس نافرمانی کے لیے استعمال ہوا ہے، جب اُس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا:

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ

"اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ جنات میں سے تھا، پس اُس نے توڑ دیا اپنے رب کا حکم"۔

قرآنِ حکیم میں بار بار فرمایا گیا وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ "اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

- اِس آیت میں ایک عتاب آمیز انداز ہے کہ جس کے ذریعے مسلمانوں کو دینی تقاضوں سے پہلو تہی پر خبر دار کیا گیا ہے۔ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ کمزوری آج کی نسبت بہت کم تھی بلکہ اُسے ہمارے موجودہ جذبۂ جہاد یا شوقِ شہادت کی کمی سے کوئی نسبت و تناسب ہی نہیں لیکن اُسی کمزوری کو بنیاد بنا کر وہ رہنمائی عطا فرمادی گئی جو ہمیشہ ہمیش کے لیے اُمت مسلمہ کو آمادۂ عمل کرنے، جھنجھوڑنے، جگانے اور شیطان کی جھپکیوں اور لوریوں سے نجات دلانے کے لیے انتہائی موثر ہے۔

آیت 17:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ... جان لو کہ اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اُس کے مرنے کے بعد... قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ہم نے کھول کھول کر بیان کر دی ہیں اپنی نشانیاں تاکہ تم سمجھو۔

- اِس آیت میں اُمید کی ایک کرن دکھائی گئی ہے۔ جس طرح زمین مردہ پڑی ہوتی ہے، زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اور ویرانی ہی ویرانی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں بارش برستی ہے، اب سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے، پھر فصلیں لہلہاتی ہیں، اب حشرات الارض بھی آجاتے ہیں اور پرندے بھی چہچہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا ہر چہار طرف زندگی کا ایک سماں محسوس ہوتا ہے۔ اِسی طرح امید دلائی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں بھی ایمان کی صورت میں ایک حیاتِ تازہ، جذبۂ انفاق، ولولۂ جہاد اور ذوقِ شہادت پیدا کر سکتا ہے۔

- یہ آیت انسان کو مایوسی سے نکال کر اُس میں ایک جذبۂ عمل پیدا کرتی ہے۔ مایوسی سے انسان میں اصلاح کا امکان ختم جاتا ہے، بقولِ اقبال:

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازداروں میں

انسان اگر محسوس کرے کہ اُس کے باطن میں اندھیارے ہیں، دل میں نورِ ایمان نہیں، عمل میں جذبۂ انفاق اور جوشِ جہاد نہیں اور تمناؤں میں شوقِ شہادت نہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کمرِ ہمت کسے، اصلاح پر آمادہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ اُس کے کشتِ قلب میں از سر نو ایک حیاتِ تازہ پیدا فرمادے گا اور ایمان اور اعمالِ صالحہ سے اُس کے کردار کی کھیتی لہلہانے لگے گی۔

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

آیت 18:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ ... بے شک صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں ... وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ... اور جنہوں نے اللہ کو قرض دیا اچھا قرض ... يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾ دوچند کیا جائے گا اُن کے لیے اِس (انفاق) کو اور اُن کے لیے عزت کا صلہ ہے۔

- اِس آیت میں غفلت سے نکل کر اللہ کی قربت کے حصول کا راستہ بتایا گیا ہے۔ اگر ایک انسان فیصلہ کر لے کہ مجھے اپنی اصلاح کرنی ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنی ہے تو قرآن اُسے ایک ایسی راہ کی رہنمائی عطا کرتا ہے جسے "سلوکِ قرآنی" کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں کم ہی لوگ ہیں جنہیں تزکیۂ نفس اور قربِ الٰہی کے حصول کی فکر ہوتی ہے۔ پھر جو لوگ اِس طرف متوجہ ہوتے بھی ہیں تو وہ محض ذکر و شغل، ضربیں لگانے، مراقبے کرنے، آبادیوں سے دور جنگلوں یا پہاڑوں کی کھوہ میں بیٹھ کر ریاضتیں کرنے کو تزکیۂ نفس اور قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل نہیں کی جاتی۔

- قربِ الٰہی کے حصول کے لیے "سلوکِ قرآنی" کی شرطِ اوّل یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب شے یعنی مال خرچ کرو۔ سورۂ حدید کی اِس آیت میں فرمایا:

إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا

"یقیناً صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور وہ جو کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دیں"۔

- آیت 11 کی وضاحت میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے مال خرچ کرنے کی دو مدات ہیں۔ غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، یتیموں، مقروضوں اور معاشی طور پر کسی بھی اعتبار سے پیچھے رہ جانے والوں کی احتیاج پوری کرنے کے لیے جو مال خرچ کیا جاتا ہے اُسے "صدقہ" کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح اللہ کے دین کی تبلیغ اور غلبے کے لیے خرچ کیے جانے والے مال کے لیے "قرضِ حسنہ" کی اصطلاح آتی ہے۔ دین کی خدمت کے لیے کیے جانے والے انفاق کے نتائج دنیا میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بندوں کی دلجوئی کے لیے اللہ اِس انفاق کو قرضِ حسنہ قرار دے کر یقین دہانی کرا رہا ہے کہ تمہارا خرچ کیا ہوا مال نہ صرف محفوظ ہے بلکہ اُسے بڑھا چڑھا کر لوٹایا جائے گا اور اِس کے ساتھ ساتھ عزت والا بدلہ بھی دیا جائے گا۔

- اللہ کی قربت کے حصول کے لیے مال خرچ کرنے کا ذکر قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ المنافقون[63] آیات 9-11 میں انفاق کو منافقت کا علاج قرار دیا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩﴾ وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٠﴾ وَلَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١١﴾

"مومنو! کہیں تمہارا مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے اور جو ایسا کرے گا تو وہی لوگ خسارہ اُٹھانے والے ہیں اور ہم نے جو کچھ تمہیں دے رکھا ہے اُس میں سے خرچ کرتے رہا کرو، اِس سے پہلے کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو پھر وہ

کہنے لگے: "اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا؟" اور جب کسی کی موت آجاتی ہے تو اللہ اُس کو ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے"۔

سورۃ التوبۃ 9 آیت 99 میں فرمایا گیا کہ انفاق فی سبیل اللہ قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے:

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ

"اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اُس کو اللہ کی قربت اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بلاشبہ وہ اُن کے لیے قربت کا باعث ہے"۔

سورۃ البقرۃ 2 آیت 177 میں انفاق کو نیکی کا اولین ولازمی مظہر قرار دیا گیا:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَ السَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ

"نیکی صرف یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرلو بلکہ اصل نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی) کتابوں پر اور رسولوں پر اور محبت کے باوجود مال دیا رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنوں (کے آزاد کرانے) میں"۔

یہی مضمون سورۃ آل عمران 3 آیت 92 میں اِس طرح بیان ہوا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

"(مومنو!) جب تک تم اُن چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کروگے کبھی نیکی حاصل نہ کرسکوگے"۔

سورۃ البلد 90 میں یہ مضمون بڑی ہی وضاحت اور موثر انداز سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان پر اپنی کچھ عنایات کا ذکر فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۙ﴿۹﴾ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ﴿۱۰﴾

(البلد 90:8-10)

"کیا ہم نے اُس کو نہیں دیں دو آنکھیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ؟ اور اُس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیے"۔

پھر انسان کی ناشکری اور بخل کا نقشہ کھینچا گیا:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ﴿۱۱﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ؕ﴿۱۶﴾ (البلد 90:11-16)

"مگر وہ گھاٹی عبور نہ کر سکا۔ اور تم کیا سمجھو کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا کسی یتیم کو جو کہ قرابت دار بھی ہو اور کسی مسکین کو جو کہ خاک میں رُل رہا ہو"۔

اِس کے بعد فرمایا کہ اب جب مال کی محبت کا بریک کھل گیا تو ایمان کی دولت سے انسان مالا مال ہو سکے گا:

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ؕ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ﴿۱۸﴾ (البلد 90:17-18)

"پھر ہو وہ ان لوگوں میں جو ایمان لائے اور جنہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور آپس میں ایک دوسرے کو باہم رحم اور شفقت کی نصیحت کی۔ یہی لوگ ہیں داہنے ہاتھ والے"۔

یہ ہے سلوکِ قرآنی جس کے مطابق اگر اللہ کی راہ میں مال خرچ کر کے دنیا کی محبت کو قربان کرنے کا مرحلہ طے کر لیا تو اب انسان کے ارتقاء میں، انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی میں، دین کی راہ پر اُس کے آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے گی۔

- وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ کے الفاظ میں بندوں کے لیے عزت افزائی کا پہلو ہے۔ اللہ کے سامنے ہم سب کی حیثیت بے کس و لاچار فقراء کی سی ہے۔ سورۃ فاطر 35 کی آیت 15 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ

"اے لوگو! تم سب اللہ کے در کے فقیر ہو اور اللہ ہی غنی اور بذاتِ خود محمود ہے"۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل میں سے ہمیں جو بھی عطا فرمادے ہم اُس کے محتاج ہیں۔ سورۃ القصص 28 کی آیت 24 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے عاجزانہ الفاظ بیان ہوئے:

رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ

"اے اللہ تو جو خیر میری جھولی میں ڈال دے میں اُس کا فقیر ہوں"۔

ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ جَائِعٌ إِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهُ فَاسْتَطْعِمُونِي أُطْعِمْكُمْ يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ عَارٍ إِلَّا مَنْ كَسَوْتُهُ فَاسْتَكْسُونِي أَكْسُكُمْ (۱)

"اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو، سوائے ان کے جن کو میں کھلا دوں۔ لہٰذا تم مجھ سے کھانے کو مانگو، میں تم کو کھانے کے لیے دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو، سوائے اُن کے جن کو میں پہنا دوں۔ لہٰذا تم مجھ سے پہننے کے لیے طلب کرو، میں تم کو پہننے کے لیے دوں گا"۔

اِس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ ہمیں اجر دیتے ہوئے ہماری عزت افزائی فرمائے گا۔ یہ اللہ کی اپنے بندوں پر کرم کی انتہا ہے۔

آیت 19:

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖٓ ... اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولوں پر ... اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ... وہی صدیق اور شہید ہیں اپنے رب کے نزدیک ... لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ ... اُن کے لیے اُن کا ثواب اور اُن کا نور ہو گا ... وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ... اور جن لوگوں نے کفر کیا ... وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ ... اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ... اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۧ وہی جہنم والے ہیں۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب البِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، باب تَحْرِيمِ الظُّلْمِ، عَنْ ابی ذر رضی اللہ عنہ

- اِس آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی کہ دل سے دنیا کی محبت نکالنے کے بعد ہی انسان کا باطن ایمان کے نور سے منور ہو گا۔ اللہ کی ذات غیور ہے۔ اُس کی قربت ایسے انسان کو حاصل ہی نہیں ہو سکتی جس کا دل کسی اور شے کی محبت میں گرفتار ہو۔ پہلے دل سے دنیوی خواہشات کی محبتیں نکلیں گی پھر دل میں اللہ کی محبت گھر کرے گی۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے اِس مضمون کو کیا خوب بیان کیا ہے کہ:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا، اب تو خلوت ہو گئی

- آیت کے اگلے حصے میں فرمایا کہ جب انسان کو اللہ کی قربت نصیب ہو جائے گی تو اب اُس کا شمار صدیقین اور شہداء میں ہو گا۔ سورۃ النساء[4] آیت 69 کی رو سے ایسے لوگوں کا شمار اُن باسعادت لوگوں میں ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا:

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا

"اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے ہی لوگ (آخرت میں) اُن (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہ کیا ہی اچھے رفیق ہیں"۔

- درجات کے اعتبار سے انبیاء کے بعد صدیقین اور شہداء کا مقام و مرتبہ ہے۔ صدیقین یعنی Introverts وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا مزاج غور و فکر کرنے والا ہو۔ وہ تنہائی پسند ہوتے ہیں، دروں بینی کی طرف مائل ہوتے ہیں، اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پالینے کی کوشش کرتے ہیں اور زندگی اور کائنات کے حقائق پر غور کر کے معرفتِ حق کے حصول کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

شہداء یعنی Extroverts ایسے لوگ ہیں جن کے مزاج میں جوش اور حرکت ہو۔ انہیں خارج سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ فعال کردار کے حامل ہوتے ہیں اور حق قبول کرنے کے بعد اُس کی تبلیغ اور غلبے کے لیے سرگرمی سے محنت کرتے ہیں۔

گویا اگر اپنے دلوں کو مال کی محبت سے پاک کر لیا اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا تو اب اللہ کی قربت کے راستے کھلے ہیں، اپنے مزاج کے اعتبار سے صدیقیت اور شہادت کے مراتبِ عظمیٰ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اِس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

- آیت کے اگلے حصے میں خوشخبری دی گئی کہ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ یعنی "اُن کے لیے اجر اور نور محفوظ ہو چکا ہے"۔ یہاں لفظ نور بہت اہم ہے۔ یہ وہی نور ہے جس کا ذکر اِسی سورت کی آیت 12 میں آ چکا ہے اور اِسی نور کے ذریعے روزِ قیامت پل صراط کا کٹھن مرحلہ طے کیا جا سکے گا۔

- آیت کے آخری حصے میں فرمایا کہ جن لوگوں نے ہماری اِن آیات کا انکار کیا اور اِن کو جھٹلایا تو ایسے ہی لوگ جہنم میں جلنے والے ہوں گے۔ جو لوگ اِن آیات سے استفادہ کرتے ہوئے دولت کی محبت سے اپنے دلوں کو پاک کریں گے، وہ جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کریں گے اور جو اِن آیات سے اعراض کریں گے، وہ جہنم کی آگ کا ایندھن بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اِس محرومی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

سورۃ الحدید حصّہ پنجم: آیات 20 تا 24

حیاتِ دنیا اور اس کے حوادث

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۱ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۲۲ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝۲۳ ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۲۴

تمہیدی نکات:

- سورۂ حدید کے چوتھے حصے میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ انسان کی روحانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دنیا اور بالخصوص مال کی محبت ہے۔ پہلے اِس محبت کے نتیجے میں دینی تقاضوں سے غفلت کا بیان آیا اور پھر اِس غفلت سے نکل کر اللہ کی قربت کے حصول کے لیے سلوکِ قرآنی کو واضح کیا گیا۔ اب سورۂ حدید کے پانچویں حصے میں دو مضامین بیان ہوئے ہیں:

i. دنیوی زندگی کی حقیقت بیان کی گئی ہے جس کے فریب میں گرفتار ہو کر انسانوں کی اکثریت دینی تقاضوں سے پہلو تہی کرتی ہے اور آخرت کی ہمیشہ ہمیش کی زندگی کو خسارے سے دوچار کر لیتی ہے۔

ii. دنیا میں پیش آنے والے حادثات و واقعات کی حقیقت بیان کی گئی ہے جن کا شدید تاثر لے کر انسان اپنی دینی ذمہ داریوں سے غافل ہو جاتا ہے۔

آیت 20:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ ... جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل ہے ... وَّ لَهْوٌ ... اور تماشا ہے ... وَّ زِيْنَةٌ ... اور زیب و زینت ہے ... وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ ... اور آپس میں بڑائی جتانا ہے ... وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ ... اور مال و اولاد کی کثرت کی ہوس ہے ... كَمَثَلِ غَيْثٍ ... بارش کی مثال کی طرح ... اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ... اچھی لگتی ہے کسان کو (بارش سے اُگنے والی) کھیتی ... ثُمَّ يَهِيْجُ ... پھر وہ خوب زور پر آتی ہے ... فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ... پھر (اے دیکھنے والے) تو اُس کو دیکھتا ہے کہ (پک کر) زرد پڑ جاتی ہے ... ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ... پھر چورا چورا ہو جاتی ہے ... وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ... اور آخرت میں ہو گا سخت عذاب ... وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ... اور اللہ کی طرف سے بخشش اور رضامندی ... وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ اور دنیا کی زندگی تو ہے ہی دھوکہ کا سامان۔

- سورۂ حدید کی اِس آیت میں اِعْلَمُوْٓا "جان لو" کے الفاظ کے ذریعے بڑی وضاحت کے ساتھ حیاتِ دنیوی کی اصل حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس کے دھوکے میں آکر ہم ایمانِ حقیقی، جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق سے تہی دامن ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں دیگر مقامات پر دنیوی زندگی کو صرف کھیل تماشا قرار دیا گیا ہے:

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الانعام 6:32)

"اور دنیا کی زندگی نہیں ہے مگر ایک کھیل اور تماشہ اور یقیناً آخرت کا گھر بہتر ہے اللہ کی نافرمانی سے بچنے والوں کے لیے"۔

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (العنکبوت 29:64)

"اور یہ دنیا کی زندگی نہیں ہے مگر ایک تماشا اور کھیل اور بلاشبہ آخرت کا گھر ہے جو ہمیشہ

رہنے والا ہے، کاش یہ (لوگ) جان لیتے"۔

اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ ؕ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ (محمد 47:36)

"دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور اللہ کی نافرمانی سے بچو تو وہ عطا فرمائے گا تمہیں تمہارا اجر"۔

اِس آیت میں دنیوی زندگی کو صرف محاورتاً کھیل تماشا نہیں کہا گیا بلکہ اِس کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے تدریج کے ساتھ اِس کے پانچ ادوار بیان کیے گئے ہیں یعنی بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ عمر اور بڑھاپا۔ پھر ہر دور کا ذکر اُس دلچسپی کے ذریعے کیا گیا ہے جو اُس دور میں انسان کے ذہن پر زیادہ سوار رہتی ہے اور اُسے دیگر ذمہ داریوں سے غافل کر کے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

- زندگی کے بالکل ابتدائی دور بچپن کو یہاں لعب یعنی کھیل کہا گیا۔ بلاشبہ یہ دور صرف کھیل کود سے عبارت ہوتا ہے۔ وہ کھیل کود کہ جس میں معصومیت کا پہلو ہوتا ہے۔ بچے کی تندرستی کا اظہار ہوتا ہی اُس کے معصومانہ کھیل سے ہے۔ اِس کھیل میں کسی لذت یا تماشے کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔

- اِس کے بعد زندگی کا دوسرا دور ہے لڑکپن جسے لھو یعنی تماشے سے موسوم کیا گیا۔ یہ زندگی کا وہ دور ہے جس میں انسان کھیل میں ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ اُس کی دلچسپی کھیل کے آلات، میدانوں اور تفریح کے مختلف ذرائع کی طرف ہوتی ہے۔ والدین کو اُس کی تعلیم اور تربیت کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ زندگی کا بڑا نازک دور ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی کے بننے اور بگڑنے کا فیصلہ اِسی دور میں ہوتا ہے۔ وقت کا درست استعمال، اچھی صحبت اور اچھے اطوار و عادات کا اختیار کرنا انسان کو بنا دیتا ہے۔ اِس کے برعکس صورتِ حال انسان کو بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔

- اِس کے بعد زندگی کا تیسرا دور جوانی کا ہے جس کے لیے زینۃ کے الفاظ آئے۔ اِس دور میں انسان کی توجہ زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کی طرف ہوتی ہے۔ انسان اِس حوالے سے بہت حساس (Conscious) ہو جاتا ہے کہ میں کیا پہن رہا ہوں اور کیسا لگ رہا ہوں۔ جو چیز انسان

کے ذہن پر سب سے زیادہ سوار ہوتی ہے وہ ہے فیشن۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کا لباس، وضع قطع اور تراش خراش فیشن کے مطابق ہو۔ انسان کے اکثر اوقات آئینے کے سامنے کھڑے ہونے اور بننے سنورنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔

- زندگی کا چوتھا دور ادھیڑ عمری کا ہے جسے یہاں تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ یعنی "باہم ایک دوسرے پر برتری لے جانے کی خواہش" سے تعبیر کیا گیا۔ مال، جائیداد، کاروبار، حیثیت، قابلیت، علم، عزت، وقار، شہرت وغیرہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مقابلہ اور آگے نکلنے کی کوشش۔ پچیس سے لے کر چالیس سال کی عمر تک انسان میں مفاخرت کا یہ جذبہ بڑا نمایاں ہوتا ہے۔ اِس کے بعد عمر کی ڈھلان شروع ہو جاتی ہے۔

- انسانی زندگی کا پانچواں اور آخری دور بڑھاپے کا ہے۔ اِس دور میں تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ یعنی "مال اور اولاد کی کثرت کی ہوس" بڑھ جاتی ہے۔ جب انسان کمانے کے قابل نہیں رہتا تو اب سمیٹ سمیٹ کر رکھنے کی خواہش زیادہ ہو جاتی ہے۔ شہری ماحول میں اولاد کی کثرت کی ہوس زیادہ نمایاں محسوس نہیں ہوتی لیکن دیہاتی یا قبائلی معاشرے میں انسان کی عزت کا دارومدار اُس کے بیٹوں کی تعداد پر ہوتا ہے۔ اِس بات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ انسان کی عزت، وقار اور آن کا تحفظ کرنے کے لیے کتنے بیٹے اور کتنے ہاتھ موجود ہیں۔ بڑھاپے کی عمر میں آکر انسان کی نفسیاتی کیفیت میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ جب وہ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ کے دور میں ہوتا ہے تو اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ مال جاتا ہے تو جائے آن نہ جانے پائے اور مونچھ اونچی رہے۔ بڑھاپے میں انسان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ مونچھ نیچی ہوتی ہے تو ہو بلکہ صاف ہی ہو جائے لیکن مال ہاتھ سے نہ جائے۔ سورۃ التکاثر 102 کی ابتدائی دو آیات میں اِس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا:

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾

"تمہیں غافل کیے رکھا کثرت کی ہوس نے یہاں تک کہ تم قبروں تک جا پہنچے"۔

اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کے کئی ارشادات ہیں:

لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغَى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللهُ عَلَى مَنْ تَابَ(۱)

"اگر آدمی کے پاس مال کے بھرے ہوئے دو میدان ہوں، تو وہ تیسرا اور چاہے گا اور آدمی کا پیٹ تو بس مٹی سے بھرے گا (یعنی مال و دولت کی اِس ختم نہ ہونے والی ہوس اور بھوک کا خاتمہ بس قبر میں جاکر ہو گا) اور اللہ اُس بندے پر عنایت اور مہربانی کرتا ہے جو اپنا رخ اور اپنی توجہ اللہ کی طرف کرلے"۔

يَهْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَتَشِبُّ مِنْهُ اثْنَتَانِ الْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمُرِ(۲)

"آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے (اور بڑھاپے کے اثر سے اِس کی ساری قوتیں مضمحل ہو کر کمزور پڑ جاتی ہے) مگر اُس کے نفس کی دو خصلتیں اور زیادہ جوان اور طاقت ور ہوتی رہتی ہیں۔ ایک دولت کی حرص اور دوسری عمر کی زیادتی کی حرص"۔

لَا يَزَالُ قَلْبُ الْكَبِيرِ شَابًّا فِي اثْنَتَيْنِ فِي حُبِّ الدُّنْيَا وَطُولِ الْأَمَلِ(۳)

"بوڑھے آدمی کا دل دو چیزوں کے بارے میں ہمیشہ جوان رہتا ہے ایک تو دنیا کی محبت اور دوسری لمبی لمبی تمنائیں"۔

بلاشبہ کثرت کی ہوس انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی، کئی کئی نسلوں کی ضروریات پوری کرنے کے اسباب موجود ہوتے ہیں، انسان قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوتا ہے، لیکن پھر بھی مزید مال و اسباب کی آرزو باقی رہتی ہے، بقولِ مرزا عبد القادر بیدل:

حرص قانع نیست بیدل ورنہ در کارِ حیات
آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

"اے بیدل! حرص قناعت پر آمادہ نہیں ورنہ معاملہ یہ ہے کہ ہم جن چیزوں کو زندگی گزارنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، اِن میں اکثریت ایسی چیزوں کی ہے جو در حقیقت درکار نہیں ہوتیں"۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرِّقَاقِ، باب مَا يُتَّقَى مِنْ فِتْنَةِ الْمَالِ، عَنْ عبدِ اللهِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ و صحیح مسلم، کتاب الزَّكَاةِ، باب لَوْ أَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَيْنِ لَابْتَغَى ثَالِثًا، عَنْ انسٍ رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح مسلم، کتاب الزَّكَاةِ، باب كَرَاهَةِ الْحِرْصِ عَلَى الدُّنْيَا، عَنْ انسٍ رضی اللہ عنہ

(۳) صحیح البخاری، کتاب الرِّقَاقِ، باب مَنْ بَلَغَ سِتِّينَ سَنَةً فَقَدْ أَعْذَرَ اللهُ إِلَيْهِ فِي الْعُمُرِ، عَنْ ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ

- یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے اگلے مرحلے میں سابقہ مرحلے کی خواہشات و مشغولیات انسان کو گھٹیا محسوس ہوتی ہیں۔ اِس حوالے سے مولانا اکبر آلہ آبادی مرحوم و مغفور کا ایک بڑا دلچسپ اور سبق آموز واقعہ ہے۔ اُن کے بچے نے ایک بار اُن سے خواہش کی کہ مجھے ایسی گیند لا کر دیں جس پر گھوڑا بنا ہوا ہو۔ مولانا مطلوبہ گیند بازار میں تلاش کرتے رہے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بچہ بڑا ہو گیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک روانہ ہو گیا۔ مولانا نے اِس دوران بھی مطلوبہ گیند کی تلاش جاری رکھی۔ ایک روز وہ ایسی گیند حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے جس پر گھوڑے کی تصویر تھی۔ جب اُن کا بیٹا بیرونِ ملک سے تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس آیا تو مولانا نے اُس کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ وہ اِس دعوت میں اپنے صاحبزادے کو ایک خاص تحفہ دیں گے۔ تمام لوگ حیران تھے کہ وہ خاص تحفہ کیا ہے جو مولانا اپنے صاحبزادے کو دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دعوت کے روز تمام مہمانوں کے سامنے مولانا نے اپنے بیٹے کو تحفے کے طور پر وہ گیند پیش کی، جس پر گھوڑا بنا ہوا تھا۔ مولانا کے صاحبزادے کو یہ تحفہ حاصل کرتے ہوئے بے حد شرمندگی ہوئی کہ والد صاحب مجھے میری اِس عمر میں کیا بچوں والا تحفہ دے رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بیٹے تمہاری زندگی کا ایک دور وہ بھی تھا جبکہ تم اِس گیند کی شدید خواہش رکھتے تھے اور اِس کے حصول کے لیے ضد کرتے تھے۔ آج تمہیں زندگی کے سابقہ مرحلے کی خواہش پر شرمندگی ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جب تم زندگی کے اگلے مرحلے یعنی آخرت میں پہنچو تو تمہیں اپنی زندگی کی آج کی خواہشات پر شرمندگی ہو۔ لہٰذا اُس روز کی شرمندگی سے بچنے کے لیے آج صرف وہ خواہشات رکھو اور اُن مصروفیات میں وقت لگاؤ جو آخرت میں تمہارے لیے مفید ہوں۔

- آیت کے اگلے حصے میں دنیا کی زندگی کے لیے بڑی مناسب تمثیل بیان کی گئی ہے۔ دنیا کی زندگی کی مثال ایک کھیتی کی سی ہے جس کا بڑھنا کسان کو بہت اچھا لگتا ہے۔ کھیتی رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی اپنے جوبن کو پہنچتی ہے۔ اِس کے بعد کھیتی پر زوال آتا ہے اور وہ زرد پڑتی ہے، سوکھ جاتی ہے اور چورا چورا ہو جاتی ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی بھی بالکل اِس کھیتی کی مانند ہے۔ کھیتی کے اُگنے اور زوال تک پہنچنے کا عمل چند ماہ میں مکمل ہوتا ہے جب کہ انسان کی دنیوی زندگی چند

برسوں تک پھیلی ہوتی ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو خوشی کے شادیانے بج رہے ہوتے ہیں۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اُسے دیکھ کر والدین کا دل باغ باغ ہو رہا ہوتا ہے۔ اب وہ شباب کو پہنچتا ہے جو زندگی سے لطف اندوز ہونے کا بہترین دور ہے۔ لیکن چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے کہ مصداق اب خواہی نخواہی ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا آتا ہے۔ اب وہ توانائی جسم و جان میں نہیں رہتی، اُمنگیں ختم ہو جاتی ہیں، چہرے پر زردی اور بالوں میں سفیدی آ جاتی ہے اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے کہ انسان کو قبر میں اُتار دیا جاتا ہے۔ جس طرح کھیتی چورا چورا ہو کر مٹی پر بکھر جاتی ہے، اِسی طرح انسان کا جسمانی وجود مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (طٰهٰ20:55)

"اِسی (مٹی) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اِسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اِسی سے دوسری دفعہ نکالیں گے"۔

حیاتِ دنیوی کا یہ تسلسل اور اِس کے یہ مختلف ادوار تو آنے ہی ہیں، اِن کو کوئی روکنے والا نہیں ہے، لیکن اصل معاملہ حیاتِ اُخروی کا ہے۔ کھیتی پر زوال آیا اور وہ ختم ہو گئی لیکن انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اب آخرت کی لامحدود زندگی کی ابدی اور مستقل حقیقت کا سامنا کرنا ہو گا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

- آخرت میں تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور دنیا کی زندگی کے مختلف امور کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔ اِس باز پرس کا ذکر ایک حدیثِ نبوی ﷺ میں اِس طرح ہوا:

لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَ اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَ اَبْلَاهُ وَمَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَ اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ[1]

---

(1) سنن ترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب ما جاء في شان الحساب والقصاص، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ

"روزِ قیامت ابنِ آدم کے قدم ہل نہ سکیں گے اپنے ربّ کے پاس سے جب تک اُس سے پانچ باتوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے۔ زندگی کے بارے میں کہ کہاں لگادی، جوانی کے بارے میں کہ کہاں کھپادی، مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور جو علم حاصل کیا اُس پر کتنا عمل کیا"۔

بازپرس کے بعد آخرت میں دو صورتیں ہوں گی یعنی عَذَابٌ شَدِیْدٌ "بڑی سخت سزا" یا مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ "اللہ کی طرف سے بخشش اور اُس کی رضا"۔

- آیت کے آخری حصے میں فرمایا وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ "اور دنیا کی زندگی نہیں ہے مگر دھوکے کا سامان"۔ بقول جگر مراد آبادی:

یہ فریبِ جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر ہے اے دلِ بے خبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انہیں چند نقش و نگار پر

دنیا کی زندگی کی لذتیں اور رعنائیاں بڑی پر کشش ہیں، اِس کی چہل پہل اور اِس کی رونقیں انسان کو اپنی طرف متوجہ کرکے اپنے اندر جذب کرلیتی ہیں۔ جو انسان دنیا کی زندگی کے ظاہری حسن و جمال کے پھندے میں پھنس گیا اور آخرت کی تیاری سے غافل ہوگیا، بلاشبہ وہ بہت بڑے خسارے سے دوچار ہوا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ (الکھف 18:103-104)

"(اے نبی ﷺ) اِن سے کہہ دیجیے کیا ہم تمہیں بتائیں سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہیں اپنے اعمال کے اعتبار سے۔ وہ لوگ جن کی ساری محنتیں بھٹک کر رہ جائیں دنیوی زندگی کے لیے اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہوگئے"۔

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان تب بنے گی جب یہ انسان کو اپنے اندر گم کرلے اور اِس کی وجہ سے وہ آخرت سے غافل ہو جائے۔ یہی زندگی انسان کے لیے آخرت کی

کھیتی بن جائے گی اگر وہ یہ سمجھ لے کہ اِس محدود دنیوی زندگی پر آخرت کی ابدی زندگی کا انحصار ہے۔ یہاں کی مختصر زندگی میں جو کچھ بویا جائے گا وہی آخرت کی ابدی زندگی میں کاٹنا پڑے گا۔ یہاں کا وقتی عمل آخرت میں امر بن جائے گا۔ انسان آخرت کو منزلِ مقصود سمجھ کر یہاں مسافروں کی طرح رہے، جیسے کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ أَهْلِ الْقُبُورِ (۱)

"دنیا میں ایسے رہو گویا کہ تم اجنبی ہو یا راستہ عبور کرنے والے مسافر اور خود کو قبر والوں میں سے شمار کرو"۔

خود نبی اکرم ﷺ کا معاملہ دنیا کے حوالے سے یہ تھا کہ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

مَا لِي وَمَا لِلدُّنْيَا مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا (۲)

"مجھے دنیا (یعنی دنیا کے سازوسامان اور اِس کی راحتوں اور لذتوں) سے کیا تعلق اور کیا لینا! میرا تعلق دنیا کے ساتھ بس ایسا ہے، جیسا کہ کوئی سوار مسافر کچھ دیر سایہ لینے کے لیے کسی درخت کے نیچے ٹھہرا، اور پھر اُس کو اپنی جگہ چھوڑ کے منزل کی طرف چل دیا"۔

ایک مسافر کو اپنے راستے سے جتنی دلچسپی ہو سکتی ہے بس اتنی دلچسپی انسان کو دنیا سے رہے۔ اگر دنیا کو منزل سمجھ لیا، یہاں جمنے اور پھیلنے اور پھلنے اور پھولنے ہی کی فکر ذہن پر سوار ہو گئی تو گویا انسان دھوکے میں آگیا اور یہی طرزِ عمل ہلاکت و تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ انسان دنیا میں رہے لیکن دنیا کی محبت کو خود پر سوار نہ ہونے دے۔ فارسی کے ایک شعر میں اِس حقیقت کو کشتی کے پانی کے ساتھ تعلق کی مثال کے ذریعے واضح کیا گیا کہ:

آب اندر زیرِ کشتی، کشتی است
آب در کشتی، ہلاکِ کشتی است

---

(۱) سنن ترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ، باب مَا جَاءَ فِي قِصَرِ الْأَمَلِ، عن عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ

(۲) سنن ترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ، باب مَا جَاءَ فِي أَخْذِ الْمَالِ بِحَقِّهِ وسنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب مثل الدنیا ومسند احمد، من مسند بنی ھاشم، بدایۃ مسند عبد اللہ بن عباس، عن عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ

پانی کشتی کے نیچے رہے تو کشتی کو دھکیل کر آگے بڑھاتا ہے۔ پانی اگر کشتی کے اندر آجائے تو اُسے غرق کر دیتا ہے۔ دنیا کی زندگی کا معاملہ بھی پانی کی طرح ہے۔ انسان دنیا کی زندگی کو استعمال کر کے آخرت سنوار سکتا ہے لیکن اِس سے جی لگا کر خود کو تباہی سے دوچار کر لیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اِس دنیا میں اپنے اوقات کی حفاظت کرتے ہوئے زندگی اِس طرح گزارے کہ:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اِس صورت میں یہ دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان نہیں بلکہ انسان کے لیے دارالعمل اور بہت بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ دنیا کی زندگی کی اصل حقیقت سمجھ لینے کا نتیجہ کیا نکلنا چاہیے؟ اِس کی وضاحت اگلی آیت میں آرہی ہے۔

آیت 21:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ... ایک دوسرے سے آگے نکلو اپنے رب کی بخشش کے حصول کے لیے ... وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ... اور اُس جنت کے حصول کے لیے جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین کے پھیلاؤ جیسا ... اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ... وہ (جنت) جو تیار کی گئی ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولوں علیہم السلام پر ... ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ... وہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے اِسے جسے وہ چاہے ... وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

- مسابقت یعنی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی خواہش انسان کی فطرت میں ہے۔ عام طور پر لوگ اِس خواہش کے تحت دنیوی نعمتوں کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مال، جائیداد، کارخانے، گاڑیاں، سہولیات اور آسائشوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ ہم اِس خواہش کا میدان بدل دیں۔ ہم نیکیوں میں اور آخرت کی نعمتوں کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں۔ قرآنِ حکیم میں یہ مضمون کئی بار آیا ہے:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (البقرۃ2:148)

"ہر ایک کا ہدف ہے جس کی طرف وہ رُخ کیے ہوئے ہے پس تم ایک دوسرے سے بازی لے جاؤ نیکیوں میں"۔

سورۃ الانبیاء[21] آیت 90 میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ

"وہ نیکیوں میں تیزی سے ایک دوسرے سے آگے نکلتے تھے اور ہمیں اُمید اور خوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی اختیار کرنے والے تھے"۔

سورۃ المطففین[83] آیت 26 میں جنت کی نعمتوں کے تذکرے کے بعد فرمایا:

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ

"چاہیے کہ (جنت کی) اِن نعمتوں کے حصول کے لیے مقابلہ کریں مقابلہ کرنے والے"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نصیحت فرمائی کہ دنیا میں کم تر لوگوں پر نگاہ رکھو اور دین میں اُن سے مقابلہ کرو جو تم سے آگے ہیں:

إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلَى مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ[1]

"جب تم میں سے کوئی ایسے شخص کو دیکھے جو مال و دولت اور جسمانی بناوٹ، یعنی شکل وصورت میں اِس سے بڑھا ہوا ہو (اور اِس کی وجہ سے اُس کے دل میں حرص و طمع اور شکایت پیدا ہو) تو اُس کو چاہیے کہ کسی ایسے بندہ کو دیکھے، جو اِن چیزوں میں اُس سے بھی کمتر ہو (تاکہ بجائے حرص و طمع اور شکایت کے صبر و شکر پیدا ہو)"۔

خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيهِ كَتَبَهُ اللهُ شَاكِرًا صَابِرًا وَمَنْ لَمْ تَكُونَا فِيهِ لَمْ يَكْتُبْهُ اللهُ شَاكِرًا وَلَا صَابِرًا مَنْ نَظَرَ فِي دِينِهِ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ فَاقْتَدَى بِهِ وَمَنْ نَظَرَ فِي دُنْيَاهُ إِلَى مَنْ هُوَ دُونَهُ فَحَمِدَ اللهَ عَلَى مَا فَضَّلَهُ بِهِ عَلَيْهِ كَتَبَهُ اللهُ

(1) صحیح البخاری، کتاب الرِّقَاقِ، باب لِيَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ... و صحیح مسلم، کتاب الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، باب، عَنْ ابی هریرۃ رضی اللہ عنہ

خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيهِ كَتَبَهُ اللهُ شَاكِرًا صَابِرًا وَمَنْ لَمْ تَكُونَا فِيهِ لَمْ يَكْتُبْهُ اللهُ شَاكِرًا وَلَا صَابِرًا مَنْ نَظَرَ فِي دِينِهِ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ فَاقْتَدَى بِهِ وَمَنْ نَظَرَ فِي دُنْيَاهُ إِلَى مَنْ هُوَ دُونَهُ فَحَمِدَ اللهَ عَلَى مَا فَضَّلَهُ بِهِ عَلَيْهِ كَتَبَهُ اللهُ شَاكِرًا صَابِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِي دِينِهِ إِلَى مَنْ هُوَ دُونَهُ وَنَظَرَ فِي دُنْيَاهُ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ فَأَسِفَ عَلَى مَا فَاتَهُ مِنْهُ لَمْ يَكْتُبْهُ اللهُ شَاكِرًا وَلَا صَابِرًا[1]

"جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اُس کو شاکرین اور صابرین میں لکھیں گے اور جس شخص میں یہ خصلتیں نہیں ہوں گی اُسے اللہ شاکرین اور صابرین میں نہیں لکھے گا (اِن دو خصلتوں کی تفصیل یہ ہے کہ) جس شخص کی یہ عادت ہو کہ وہ دین کے معاملے میں تو اللہ کے اُن بندوں پر نظر رکھے جو دین میں اُس سے فائق اور بالاتر ہوں اور اُن کی پیروی اختیار کرے اور دنیا کے معاملے میں اُن (غریب و مسکین اور خستہ حال بندوں) پر نظر رکھے جو دنیوی حیثیت سے اُس سے بھی کمتر ہوں، اور اِس پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے محض اپنے فضل و کرم سے اُسے اِن بندوں سے زیادہ دنیوی نعمتیں دے رکھی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صابر و شاکر لکھا جائے گا اور جس کا حال یہ ہو کہ دین کے بارے میں تو ہمیشہ اپنے سے ادنیٰ درجے کے لوگوں کو دیکھے اور دنیا کے بارے میں اپنے سے بالاتر لوگوں پر نظر ہو اور جو دنیوی نعمتیں اُس کو نہیں ملی ہیں اُن کے نہ ملنے پر افسوس اور رنج کرے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ شاکر و صابر نہیں لکھا جائے گا"۔

دنیا میں کم تر کو دیکھنے سے اللہ کے لیے شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ مجھے اللہ نے بہتر حالات میں رکھا ہے اور اپنی کسی مشکل پر صبر کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے کہ دوسرا مجھ سے بھی زیادہ مشکل حالات میں ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ اپنی سیاحت کے دوران ایسا مرحلہ بھی آیا کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ دل میں خیال آیا کہ پروردگار نے لوگوں کو کیا کیا نعمتیں دی ہیں اور میرے پاؤں میں جوتے تک نہیں۔ آگے جا کر ایک ایسے

(1) سنن ترمذی، کتاب صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالرَّقَائِقِ وَالْوَرَعِ عن رسول الله، باب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ أَوَانِي الْحَوْضِ، عن عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہ

جانے کی بے نظیر مثالیں پیش کیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنا آدھا مال لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اِس امید کے ساتھ کہ وہ اِس موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سبقت لے جائیں گے۔ لیکن اُن کی یہ نیک خواہش پوری نہ ہو سکی کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا پورا مال پیش کر چکے تھے اور گھر پر صرف اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام چھوڑ آئے تھے[1]:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

- اِس آیت میں ہمیں دعوت دی گئی کہ ہم اپنا ہدف بنائیں آخرت میں بخشش اور جنت کے حصول کو۔ جنت بھی وہ جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین جتنا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگوں کی زندگی بھر کی کمائی کا حاصل ایک مکان ہوتا ہے۔ یہ مکان خواہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن اِس کے رقبے کا جنت کے پھیلاؤ سے کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اِس مکان کی سہولیات کم تر بھی ہیں اور عارضی بھی جبکہ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (الاعلیٰ 87:17) کے مصداق "جنت کی نعمتیں بہتر بھی ہیں اور دائمی بھی"۔ حدیثِ قدسی ہے:

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَعْدَدْتُّ لِعِبَادِيَ الصّٰلِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ[2]

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے اُن کا ذکر سنا اور نہ ہی کسی دل پر اُن کا خیال گزرا، اگر تم چاہو تو پڑھ لو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ... انسان نہیں جانتے کہ اُن کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے (السجدۃ 32:17)"۔

اِسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

---

(۱) الترغیب والترھیب لقوام السنۃ، باب الترغیب فی الصدقۃ وفضل المتصدقین، عن الشعبی رحمہ اللہ

(۲) صحیح البخاری، کتاب بَدْءِ الْخَلْقِ، باب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ وَأَنَّهَا مَخْلُوقَةٌ، وصحیح مسلم، کتاب الْجَنَّةِ وَصِفَةِ نَعِيمِهَا وَأَهْلِهَا... عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ

اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ[1]

"عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو پالے اور عمل کرے موت کے بعد کی زندگی کے لیے"۔

- آیت کے اگلے حصے میں جنت کے بارے میں آگاہ کیا گیا کہ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ "وہ تیار کی گئی ہے اُن کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں ﷺ پر"۔ یہاں ایمان سے مراد حقیقی یعنی قلبی ایمان ہے جس کا نتیجہ انسان کے نیک اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اِس نکتے کی تفسیر خود قرآن نے سورۃ آلِ عمران[3] کی آیات 133-135 میں اِس طرح کی:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۡ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۡ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

"اور ایک دوسرے سے تیزی دکھاؤ اپنے رب کی بخشش اور اُس جنت کے حصول کے لیے جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو تیار کی گئی ہے اللہ کی نافرمانی سے بچنے والوں کے لیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آسودگی اور تنگی میں (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے۔ اور جب وہ کوئی کھلی بے حیائی کر بیٹھتے ہیں یا اپنے حق میں کسی بُرائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور وہ جان بوجھ کر اڑے نہیں رہتے اپنے کسی (برے) عمل پر جو اُنہوں نے کیا"۔

---

[1] سنن الترمذی، کتاب صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالرَّقَائِقِ وَالْوَرَعِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَاب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ أَوَانِي الْحَوْضِ و سنن ابن ماجة، كتاب الزُّهْدِ، بَاب ذِكْرِ الْمَوْتِ وَالِاسْتِعْدَادِ لَهُ، عَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ ﷺ

- آیت کے آخر میں فرمایا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ "وہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے یا دے گا جسے چاہے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔ فضل سے مراد ہے اللہ کی طرف سے بغیر استحقاق کے دی جانے والی شے۔ اِس کے بالمقابل اجرت اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں جو باہم مترادف ہیں۔ اِن کا مطلب ہے بدلہ، جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اکثر جنت کے حصول کو اللہ کا فضل کہا گیا ہے۔ گویا انسان صرف اپنے عمل کے ذریعے جنت کا مستحق نہیں بن سکتا۔ مراد یہ ہے کہ تم محنت کرو اور دین کے لیے مال و جان کی قربانی دو لیکن جان لو جنت پھر بھی اللہ کے فضل سے ملے گی نہ کہ تمہارے عمل سے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

لَنْ يُدْخِلَ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ قَالُوا: وَلَا أَنْتَ؟ يَا رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللهُ مِنْهُ بِفَضْلٍ وَرَحْمَةٍ (۱)

"تم میں سے کسی کا عمل ہرگز اُس کو جنت میں نہیں لے جا سکے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا اور کیا آپ بھی نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ؟ فرمایا ہاں، میں بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ ڈھانپ لے مجھے اپنی رحمت اور فضل سے"۔

آیت 22:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ ... نہیں پڑتی کوئی آفت زمین پر ... وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ... اور نہ ہی خود تم پر ... اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ... مگر ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے ... مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ... قبل اِس کے کہ ہم اُسے ظاہر کریں ... اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ بے شک ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔

اِس آیت میں اُن حوادث کے حوالے سے ایمان افروز ہدایت دی گئی ہے جن کے اثرات انسانی زندگی پر اِس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ وہ اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ حوادث کے لیے یہاں لفظ "مصیبت" آیا ہے جس کے لغوی معنی ہیں وارد ہونے والی شے خواہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالْجَنَّةِ وَالنَّارِ، باب لَنْ يَدْخُلَ أَحَدٌ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهِ بَلْ بِرَحْمَةِ اللهِ تَعَالَى، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

وہ خوشگوار ہو یا تکلیف دہ۔ عام طور پر تکلیف دہ معاملے کا انسان زیادہ تاثر لیتا ہے لہٰذا "مصیبت" کا لفظ اکثر صرف اِسی صورت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خوشگوار یا تکلیف دہ حوادث زمین پر بھی وارد ہوتے ہیں اور کسی انسان پر بھی۔ زمین پر اِن کی صورت بارانِ رحمت، فرحت بخش ہواؤں اور اچھی فصلوں یا زلزلے، طوفانی بارشوں، ژالہ باری، سیلاب، سمندری طوفان، تیز ہواؤں، خراب فصلوں وغیرہ کی ہوتی ہے۔ انسان پر اِن کا ورود کامیابیوں یا ناکامیوں، مال و جان کے نقصان اور بیماریوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اِس آیت میں رہنمائی عطا کی گئی کہ:

1. زمین اور انسانوں پر وارد ہونے والے حوادث اللہ کے حکم سے وارد ہوتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق اور اِس میں جاری مختلف معاملات کسی اندھے بہرے مادّہ کی کار فرمائی نہیں ہیں۔ ایک حکیم و دانا ہستی اِس کائنات کی خالق ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے اذن سے ہو رہا ہے۔ دنیا میں نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ، جب تک اللہ کا اذن نہ ہو۔ ترمذی میں روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو تاکید فرمائی:

إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ؛ وَاعْلَمْ أَنَّ الأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلاَّ بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلاَّ بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الأَقْلاَمُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ[1]

"جب تو سوال کر تو صرف اللہ سے سوال کر، جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے مدد طلب کر، اور یہ بات جان لے کہ اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے طے کر دیا اور اگر وہ جمع ہو کر تجھے نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے طے کر دیا۔ قلم اٹھائے جا چکے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں"۔

ہر واقعے کے پیچھے بظاہر کچھ اسباب نظر آتے ہیں لیکن اسباب کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے حکم کی ہے۔ جو بھی حالات وارد ہو رہے ہیں، اُن میں بظاہر کوئی بھلائی یا

[1] سنن الترمذی، كتاب صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالرَّقَائِقِ وَالْوَرَعِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَاب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ أَوَانِي الْحَوْضِ

برائی اپنے لیے کمارہا ہے لیکن اِن کے پیچھے فاعلِ حقیقی صرف اور صرف اللہ ہے۔ ممکن ہے کہ کسی ڈاکٹر نے غلط انجکشن لگادیا ہو، ممکن ہے کہ کسی نے وار کیا ہو اور انسان اُس وار سے ہلاک ہو گیا، لیکن یہ سب کا سب ہو نہیں سکتا تھا جب تک اللہ تعالیٰ کا اذن نہ ہو۔ موت کا وقت اللہ تعالیٰ نے طے کر رکھا ہے۔ جب تک موت کا وقت نہ آئے، انسان مر نہیں سکتا۔ بڑا حکیمانہ قول ہے:

اَلْمَوْتُ خَيْرُ الْحَافِظَةِ وَالْمَوْتُ خَيْرُ الْوَاعِظَةِ

"موت بہترین محافظ ہے اور موت بہترین واعظ ہے"۔

موت محافظ اِس معنی میں ہے کہ اِس کا وقت طے ہے لہٰذا جب تک اِس کا وقت نہیں آتا، کوئی موت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ موت بہترین واعظ ہے یعنی اگر انسان کو موت یاد رہے تو پھر اُس کی زندگی کا رخ صحیح ہو جاتا ہے۔

2. جو واقعات بھی ظہور پذیر ہو رہے ہیں وہ پہلے سے ایک کتاب یعنی کتابِ تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ معاملہ مشکل نظر آتا ہے لیکن واضح کیا گیا کہ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ "بے شک یہ اللہ پر بہت آسان ہے"۔ اگر اللہ کی ذات وصفات کی بے حد وحساب وسعت سامنے ہو تو اِس حوالے سے کوئی تعجب نہ ہو گا۔

مذکورہ بالا دو حقائق سامنے ہوں تو اِس کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے وہ اگلی آیت میں بیان ہوا۔

آیت 23:

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ ... تاکہ تم افسوس نہ کرو اُس پر جو شے تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے ...
وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ... اور نہ اتراؤ اُس پر جو تم کو وہ (اللہ) عطا کرے ... وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ﴿۲۳﴾ اور اللہ پسند نہیں کرتا خود کو کچھ سمجھنے والے اور بڑائی کرنے والے کو۔

حیاتِ دنیوی کے دوران ہر انسان کو بدلتے ہوئے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ تکلیف دہ واقعات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں اور مسرت بخش لمحات بھی آتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تین عالم بنائے ہیں۔ ایک یہ دنیا کا عالم ہے، دوسرا عالمِ جنت ہے اور تیسرا عالمِ جہنم۔ جنت ایسا عالم ہے جہاں راحتیں ہی راحتیں ہیں۔ جہنم ایسا عالم ہے کہ جہاں پر تکالیف ہی تکالیف ہیں۔ عالمِ دنیا میں راحتیں بھی ہیں اور

تکالیف بھی۔ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ تکلیف یا راحت مسلمان کو بھی پہنچتی ہے اور کافر کو بھی۔ البتہ اِس حوالے سے ایک مسلمان اور ایک کافر کے ردِّ عمل میں فرق ہونا چاہیے۔ اِس لیے کہ مسلمان اللہ اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہے جبکہ کافر اِس نعمت سے محروم ہے۔ مسلمان جب اِس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ ہر معاملہ اللہ ہی کے حکم سے ظہور پذیر ہوا اور کتابِ تقدیر میں وہ پہلے ہی سے درج تھا تو اب نہ وہ ناخوشگوار حالات پر شدتِ غم سے نڈھال ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کامیابی پر اتراتا اور اکڑتا ہے۔ اِس کی وجہ مذکورہ بالا دو نکات کے حسبِ ذیل مضمرات ہیں:

1. عام آدمی کو اگر کوئی تکلیف آتی ہے تو وہ اِسے کسی دیوتا کی ناراضگی یا اسباب کے مخالف ہونے کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اگر اُسے کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے تو اِسے کسی دیوتا کی نظرِ کرم یا اسباب کے موافق ہونے کا ثمرہ قرار دیتا ہے۔ کسی بھی واقعہ کے ظہور کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی گمراہی ہے۔ ہدایت کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ اِسے اللہ کی طرف منسوب کیا جائے۔ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی کے مطابق "ہر نعمت اللہ دیتا ہے اور تکلیف بھی وہی دیتا ہے"۔ خیر ہو یا شر، خوشگوار حالات ہوں یا ناگوار، جو بھی ہے من جانب اللہ ہے۔ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا، لہٰذا نقصان کی صورت میں اسباب کے خلاف پیچ و تاب اور انتقام کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ اِسی طرح اگر کوئی خیر ملی ہے تو وہ اللہ کا فضل ہے نہ کہ انسان کا اپنا کمال۔ لہٰذا انسان میں نہ تکبر کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اتراتا اور اپنی بڑائی کرتا ہے۔

2. اِس کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے تمام معاملات پہلے ہی سے طے شدہ اور علمِ خداوندی میں موجود ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے یہاں کوئی واقعہ ہمارے لیے حادثہ ہو، در حقیقت حادثہ نہیں ہے۔ کوئی بات انہونی نہیں ہے۔ جو تکلیف آئی ہے وہ اپنے طے شدہ وقت پر آئی ہی تھی اور تقدیر میں لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا۔

3. اللہ کے ہر فیصلے میں ضرور کوئی خیر پوشیدہ ہے۔ سورۃ آلِ عمران 3 آیت 26 میں فرمایا گیا:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"کہو کہ اے اللہ (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"۔

ہم اپنے ناقص علم کی وجہ سے اللہ کے فیصلے میں خیر کے پہلو کو سمجھ نہیں سکتے لیکن اللہ کے فیصلے میں ضرور ہماری بہتری ہوتی ہے۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ 2: 216)

"تم پر (اللہ کی راہ میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے خواہ وہ تمہیں ناگوار ہو، ممکن ہے تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ممکن ہے تم کسی شے کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے نقصان دہ ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

سورۃ التوبۃ 9 آیات 51-52 میں منافقین کو اہلِ ایمان کی طرف سے آگاہ کیا گیا:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۗ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

"(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے ہمیں ہر گز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لیے۔ وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ کہہ دیجیے کہ تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو بھلائیوں میں سے ایک کی اور ہم تمہارے حق میں منتظر ہیں کہ بھیجے اللہ تم پر کوئی عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں۔ سو انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں"۔

حدیثِ مبارکہ ہے:

عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ [1]

"مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اُس کے ہر معاملے میں خیر ہے اور یہ چیز مومن کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں، اگر اُسے نعمت ملے وہ شکر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے اور اگر اُسے تکلیف پہنچے وہ صبر کرے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے"۔

اللہ تعالیٰ ہمارا ہم سے بڑھ کر خیر خواہ اور ہماری مصلحتوں کا ہم سے بہتر جاننے والا ہے:

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

"ہمارا کارساز ہمارے مسائل کے حل کا دھیان رکھتا ہے۔ ہمارا بذاتِ خود اپنے مسائل کے حل کے بارے میں متفکر ہونا ہمیں پریشان کر دیتا ہے"۔

ہمیں اِس دنیا میں جو بھی تکلیف پہنچتی ہے، اگر ہم نے اُس پر صبر کیا تو وہ روزِ قیامت ہمارے گناہوں کا کفارہ اور ہمارے حق میں باعثِ اجر و ثواب ہو گی۔ ارشاداتِ نبوی ﷺ ہیں:

مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ [2]

"جس بندے کے بارے میں اللہ خیر کا فیصلہ فرماتا ہے، اُسے مصیبت سے دوچار کر دیتا ہے"۔

إِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوبَةَ فِي الدُّنْيَا، وَإِذَا أَرَادَ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهِ حَتَّى يُوَافِيَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [3]

"جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس کو (اُس کے گناہوں کی سزا) جلد ہی دنیا میں دے دیتا ہے (یعنی تکلیفوں اور آزمائشوں کے ذریعے سے اُس کے گناہوں کی معافی کا سامان پیدا کر دیتا ہے) اور جب اپنے بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُس سے اُس کے گناہ کی سزا (دنیا میں) روک لیتا ہے، یہاں تک کہ قیامت والے دن اُس کو پوری سزا دے گا"۔

نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا:

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، بَاب الْمُؤْمِنُ أَمْرُهُ كُلُّهُ خَيْرٌ، عَنْ صُهَيْبٍ رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح البخاری، کتاب المرضی، بَاب مَا جَاءَ فِي كَفَّارَةِ الْمَرَضِ، عَنْ ابی هريرة رضی اللہ عنہ

(۳) سنن الترمذی، کتاب الزهد عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَاب مَا جَاءَ فِي الصَّبْرِ عَلَى الْبَلَاءِ، عَنْ انس رضی اللہ عنہ

إِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ، وَإِنَّ اللهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْماً ابْتَلَاهُمْ، فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا، وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ (۱)

"آزمائش جتنی عظیم ہوگی، بدلہ بھی اِسی قدر عظیم ہوگا اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو پسند فرماتا ہے تو اُس کو آزمائش سے دوچار فرمادیتا ہے، پس جو (اُس سے) راضی ہوتا ہے، اُس کے لیے (اللہ کی) رضا ہے اور جو (اُس کی وجہ سے اللہ سے) ناراض ہوتا ہے، اُس کے لیے (اللہ کی) ناراضی ہے"۔

يَقُولُ اللهُ تَعَالَى، مَا لِعَبْدِي الْمُؤْمِنِ عِنْدِي جَزَاءٌ إِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّهُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ احْتَسَبَهُ إِلَّا الْجَنَّةُ (۲)

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں جب اپنے مومن بندے کے اہلِ دنیا میں سے کسی پیارے کو واپس لے لیتا ہوں، لیکن وہ اُس پر ثواب کی نیت سے (صبر و رضا کا مظاہرہ کرے) اُس کے لیے میرے پاس جنت کے سوا کوئی بدلہ نہیں ہے"۔

مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا أَذًى وَلَا غَمٍّ حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ (۳)

"مسلمان کو جو بھی تکان، بیماری، فکر، غم اور تکلیف پہنچتی ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اِس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ معاف فرمادیتا ہے"۔

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهِ، ابْتَلَاهُ اللهُ فِي جَسَدِهِ أَوْ فِي مَالِهِ أَوْ فِي وَلَدِهِ ثُمَّ صَبَّرَهُ عَلَى ذٰلِكَ حَتَّى يُبَلِّغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِي سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ تَعَالَى (۴)

"کسی بندۂ مؤمن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بلند مقام طے ہو جاتا ہے جس کو وہ اپنے عمل (مجاہدے) سے نہیں پاسکتا تو اللہ تعالیٰ اُس کو کسی جسمانی یا مالی تکلیف میں یا اولاد کی طرف سے کسی صدمے یا پریشانی (غیر اختیاری مجاہدے) میں مبتلا کر دیتا ہے، پھر اُس کو

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَاب مَا جَاءَ فِي الصَّبْرِ عَلَى الْبَلَاءِ، عَنْ انس رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، بَاب الْعَمَلِ الَّذِي يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللهِ، عَنْ ابی هریرة رضی اللہ عنہ

(۳) صحیح البخاری، کتاب المرضی، بَاب مَا جَاءَ فِي كَفَّارَةِ الْمَرَضِ، و صحیح مسلم، کتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَاب ثَوَابِ الْمُؤْمِنِ فِيمَا يُصِيبُهُ مِنْ مَرَضٍ...، عَنْ ابی هریرة رضی اللہ عنہ

(۴) سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، بَاب الْأَمْرَاضِ الْمُكَفِّرَةِ لِلذُّنُوبِ، عَنْ لجلاج بن حکیم رضی اللہ عنہ

صبر کی توفیق دے دیتا ہے، یہاں تک کہ اُسے اُس بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جو اُس کے لیے پہلے سے طے ہو چکا ہوتا ہے"۔

سورۃ الکہف[18] کی آیات 65-82 میں ایک قصے کے ذریعے واضح کیا گیا کہ واقعے کا ظاہر کچھ ہوتا ہے لیکن اُن کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ اِس قصے میں تین واقعات ایسے آئے ہیں کہ جن کا ظاہر شر محسوس ہو رہا تھا لیکن اُن کی حقیقت خیر تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ایک کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ نکال کر پھینک دیا۔ بظاہر یہ کام ظلم تھا لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے وضاحت کی کہ ایک بادشاہ صحیح سالم کشتیوں کو غصب کرتا آ رہا تھا۔ اگر یہ کشتی سالم ہوتی تو بادشاہ چھین لیتا۔ گویا ایک تختہ ضائع ہو گیا لیکن پوری کشتی بچ گئی۔ اِس کے بعد ایک بچے کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا۔ بظاہر یہ قتلِ ناحق تھا لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے بتایا کہ اِس بچے نے بڑے ہو کر اپنے والدین کے لیے وبالِ جان بننا تھا۔ وہ اپنا بھی نامۂ اعمال سیاہ کرتا اور والدین کو بھی پریشان کرتا۔ اللہ تعالیٰ والدین کو اِس سے بہتر بچہ عطا فرمائے گا۔ اِس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک بستی میں پہنچے۔ بستی والوں نے اِن مسافروں کو کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے بستی میں ایک ایسی دیوار تعمیر کر دی جو بالکل گرنے والی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا کہ آپ نے بغیر معاوضے کے بخیل بستی والوں کا یہ کام کر دیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے وضاحت کی کہ اِس دیوار کے نیچے دو یتیم بچوں کی وراثت ایک خزانہ کی صورت میں دفن ہے۔ اگر دیوار گر جاتی تو وہ خزانہ بخیل بستی والوں کے ہاتھ میں آ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ دیوار تعمیر کرا دی تاکہ حق داروں کو اُن کا حق مل جائے۔ آخر میں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے سب کچھ اللہ کے حکم سے کیا اور یہ سب اللہ کی رحمت کے مظاہر ہیں۔

4. اِس دنیا کی ہر راحت یا تکلیف عارضی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل[16]:96)

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے (یعنی کبھی ختم نہیں ہو گا) اور جن لوگوں نے صبر کیا ہم اُن کو اُن کے اعمال کا نہایت اچھا بدلہ دیں گے"۔

اگر کوئی شے ہم سے چھن گئی ہے تو اُس نے ایک روز فنا ہونا ہی تھا۔ دنیوی زندگی تو ہے ہی بڑی محدود۔ اصل زندگی تو ہے ہی آخرت کی۔ انسان کی تمنا یہ ہونی چاہیے کہ اے اللہ ہمیں آخرت کی نعمتیں عطا فرما۔ ہمیں اپنے مرنے والے عزیزوں کا جنت میں ساتھ عطا فرما۔ جنت کا ساتھ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور دنیا کا ساتھ تو لازمی ختم ہو گا۔ آج اگر ہمارے کسی عزیز کا انتقال ہوا ہے تو اُس نے ایک روز مرنا ہی تھا اور ہمیں بھی کسی روز یہاں سے رخصت ہونا ہی ہے۔ اِسی لیے مصیبت پر یہ کلمات پڑھنا مسنون ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرۃ 2: 156) "ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ جانا ہے"۔ ایک بادشاہ نے شاندار محل بنوایا اور ایک درویش کو اُس محل کے نظارہ کی دعوت دی۔ درویش نے تبصرہ کیا کہ اگر کسی طرح دو باتوں کا ازالہ ہو جائے تو پھر یہ محل بہت ہی عمدہ ہے۔ پہلی یہ کہ محل کے بارے میں ضمانت مل جائے کہ یہ ہمیشہ رہے گا۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ سلامت بھی ہمیشہ اِس محل میں رہ سکیں گے۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ محل یہیں رہے گا اور بادشاہ سلامت دنیا سے چلے جائیں گے یا بادشاہ سلامت کے سامنے کوئی آفت اِس محل کو برباد کر دے گی۔

5. اللہ نے دنیوی زندگی ہمیں عطا ہی اِس لیے کی ہے کہ وہ ہمارا امتحان لے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک 67: 2)

"اُس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے"۔

علامہ اقبال نے اِس حقیقت کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اِس دنیا میں انسان پر جو اچھے یا برے حالات آتے ہیں وہ در حقیقت اللہ کی طرف سے ایک امتحان و آزمائش کا ذریعہ ہیں:

وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (الانبیاء 21:35)

"اور ہم تمہیں آزماتے ہیں شر اور خیر سے جو آزمائش کی صورتیں ہیں اور تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے"۔

اِس حقیقت کو بڑے موثر اسلوب میں بیان کیا گیا سورۃ الفجر 89 کی آیات 15 اور 16 میں:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ۝ وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ۝

"پس انسان (کا معاملہ عجیب ہے کہ) جب اُس کا پروردگار اُس کو آزماتا ہے تو اُسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اُس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا"۔

در حقیقت دنیوی زندگی میں نہ تو خوشحالی عزت کی علامت ہے اور نہ ہی تنگدستی ذلت کا مظہر۔ یہ دونوں صورتیں امتحان اور آزمائش کی ہیں۔ اللہ ہر پہلو سے انسان کو جانچتا ہے۔ کبھی وہ دے کر آزماتا ہے اور کبھی چھین کر۔ ایک شکر کا امتحان ہے اور دوسرا صبر کا۔ کبھی اللہ تعالیٰ نعمتیں دیتا ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ بندہ شکر کرتا ہے یا نہیں۔ کہیں عیش میں اللہ کو بھول تو نہیں جاتا:

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا، وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کبھی اللہ تعالیٰ تکلیف دیتا ہے یہ جانچنے کے لیے کہ بندہ صبر کرتا ہے یا نہیں۔ قرآنِ حکیم میں بار بار نیک بندوں کی صفات آئی ہیں شکور اور صبار۔ نعمتوں کے ملنے پر ہمیں شکر کرنا چاہیے اور تکلیف آنے پر صبر۔ مصائب پر شور و واویلا کرنے، مرثیہ پڑھنے اور اللہ سے شکوہ یا شکایت کرنے سے مرنے والے واپس نہیں آتے اور نقصانات کی تلافی نہیں ہوتی لیکن ہم اجر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض خواتین غم کے موقع پر اِس انداز سے مرنے والے کی باتیں یاد دلاتی ہیں یا نوحہ پڑھتی ہیں کہ اِس سے صدمے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ عمل اللہ کو پسند نہیں کیونکہ ایسا کرنا اللہ کے فیصلے پر عدم اطمینان کا اظہار ہے۔ اِس حوالے سے احادیثِ مبارکہ ہیں:

إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ بَرِئَ مِنَ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَّةِ(۱)

"بے شک اللہ کے رسول ﷺ اُس عورت سے بیزار ہیں جو نوحہ کرنے والی (مصیبت کی وجہ سے)، سر منڈانے والی اور گریبان چاک کرنے والی ہو"۔

اَلنَّائِحَةُ إِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا، تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِنْ قَطِرَانٍ، وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ(۲)

"بین کرنے والی عورت، اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اُسے قیامت کے دن اِس طرح کھڑا کیا جائے گا کہ اُس پر تارکول کا کرتا اور خارش کی زرہ ہو گی"۔

اِثْنَتَانِ فِي النَّاسِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ اَلطَّعْنُ فِي النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ(۳)

"دو چیزیں لوگوں میں ایسی ہیں، جو اُن کے حق میں کفر ہیں۔ نسب میں طعنہ زنی کرنا اور میت پر بین کرنا"۔

لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ(۴)

"وہ شخص ہم میں سے نہیں، جس نے رخساروں کو پیٹا اور گریبانوں کو چاک کیا اور جاہلیت کے بول بولے (یعنی بین کیا)"۔

عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ أَخَذَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ عِنْدَ الْبَيْعَةِ أَنْ لَّا نَنُوْحَ(۵)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے بیعت کے وقت ہم سے یہ عہد لیا کہ ہم بین نہیں کریں گی"۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب مَا يُنْهَى مِنَ الْحَلْقِ عِنْدَ الْمُصِيبَةِ و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تَحْرِيمِ ضَرْبِ الْخُدُودِ وَشَقِّ الْجُيُوبِ وَالدُّعَاءِ بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ، عَنْ ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب التَّشْدِيدِ فِي النِّيَاحَةِ، عَنْ ابی مالك الاشعری رضی اللہ عنہ

(۳) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب إِطْلَاقِ اسْمِ الْكُفْرِ عَلَى الطَّعْنِ فِي النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةِ، عَنْ ابی هریرة رضی اللہ عنہ

(۴) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، بَاب لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تَحْرِيمِ ضَرْبِ الْخُدُودِ وَشَقِّ الْجُيُوبِ وَالدُّعَاءِ بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ، عَنْ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

(۵) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، بَاب مَا يُنْهَى مِنَ النَّوْحِ وَالْبُكَاءِ وَالزَّجْرِ عَنْ ذَلِكَ و صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب التَّشْدِيدِ فِي النِّيَاحَةِ

عَنْ أُسَيْدِ بْنِ أَبِي أُسَيْدٍ عَنِ امْرَأَةٍ مِنَ الْمُبَايِعَاتِ قَالَتْ: كَانَ فِيمَا أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي الْمَعْرُوفِ الَّذِي أَخَذَ عَلَيْنَا أَنْ لَا نَعْصِيَهُ فِيهِ أَنْ لَا نَخْمِشَ وَجْهًا وَلَا نَدْعُوَ وَيْلًا وَلَا نَشُقَّ جَيْبًا وَلَا نَنْشُرَ شَعْرًا (۱)

"حضرت اُسید بن ابی اُسید اُس عورت سے روایت کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے والوں میں سے تھی۔ اُس نے بیان کیا، وہ بھلائی کے کام، جن کے کرنے کا اللہ کے رسول ﷺ نے ہم سے عہد لیا تھا، اُن میں یہ عہد بھی تھا کہ ہم اللہ کی نافرمانی نہ کریں، چہرہ نہ نوچیں، ہلاکت کی بددعا نہ کریں، گریبان چاک نہ کریں اور بال نہ بکھیریں"۔

پھر اصل صبر وہ ہے جو فوری طور پر کیا جائے، ورنہ شکوے شکایات کرنے کے بعد صبر تو کرنا ہی پڑتا ہے اور اُس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بخاری اور مسلم میں یہ واقعہ بیان ہوا:

مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِامْرَأَةٍ تَبْكِي عِنْدَ قَبْرٍ فَقَالَ اتَّقِي اللهَ وَاصْبِرِي فَقَالَتْ إِلَيْكَ عَنِّي فَإِنَّكَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِيبَتِي وَلَمْ تَعْرِفْهُ فَقِيلَ لَهَا إِنَّهُ النَّبِيُّ ﷺ فَأَتَتْ بَابَ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَهُ بَوَّابِينَ فَقَالَتْ لَمْ أَعْرِفْكَ فَقَالَ إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى (۲)

"نبی کریم ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو ایک قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ نے اُس سے فرمایا، اللہ سے ڈر اور صبر کر۔ اُس نے کہا مجھ سے دُور ہو جا! تجھے وہ مصیبت نہیں پہنچی جو مجھے پہنچی ہے۔ اُس نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں پہچانا (اِس لیے فرطِ غم میں اُس نے نازیبا انداز اختیار کیا)۔ بعد میں اُسے بتلایا گیا کہ وہ تو نبی ﷺ تھے۔ چنانچہ (یہ سن کر) وہ آپ کے دروازے پر آئی، وہاں دربانوں کو نہیں پایا، (آکر) اُس نے کہا کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ آپ نے اُسے (پھر وعظ کرتے ہوئے) فرمایا، صبر تو یہی ہے کہ صدمے کے آغاز میں کیا جائے (بعد میں تو صبر آ ہی جاتا ہے)"۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی النوح

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور و صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فِي الصَّبْرِ عَلَى الْمُصِيبَةِ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى، عَنْ انسِ بنِ مالكٍ رضی اللہ عنہ

6. آخرت میں جواب دہی کے حوالے سے صبر کا امتحان شکر کے امتحان کے مقابلے میں آسان ہے۔ وہ آزمائش نسبتاً آسان ہے جس میں اللہ نے کچھ چھین کر آزمایا ہو بجائے اِس کے کہ اللہ نے کچھ دے کر امتحان لیا ہو۔ روزِ قیامت ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (التکاثر 102: 8) کے مطابق "ایک ایک نعمت کے حوالے سے جوابدہی کرنی ہو گی"۔ زندگی، مال اور اولاد کے حوالے سے باز پرس ہو گی۔ اِس دنیا میں اِن نعمتوں کی جتنی فراوانی ہو گی اتنا ہی حساب دینا یعنی Account for کرنا بھاری ہو جائے گا۔ اِس کے برعکس اگر انسان کے پاس دنیوی نعمتیں کم ہیں تو انسان کے لیے جوابدہی کا مرحلہ آسان ہو جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات ہیں:

اِطَّلَعْتُ فِي الْجَنَّةِ فَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا الْفُقَرَاءَ وَاطَّلَعْتُ فِي النَّارِ فَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا النِّسَاءَ (۱)

"میں نے جنت میں دیکھا تو اُس میں اکثر تعداد فقراء کی تھی اور جہنم میں دیکھا تو اُس میں اکثر تعداد عورتوں کی تھی"۔

يَدْخُلُ الْفُقَرَاءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْأَغْنِيَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ (۲)

"فقراء جنت میں مالداروں سے پانچ سو برس قبل داخل ہوں گے"۔

يَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِيْنَ يُعْطَى أَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ (۳)

"قیامت کے دن جب اُن بندوں کو جو دنیا میں مبتلائے مصائب رہے، اِن مصائب کے عوض اجر و ثواب دیا جائے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں ہمیشہ آرام اور چین سے رہے، حسرت کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں"۔

صبر کی آزمائش کے نسبتاً آسان ہونے کے حوالے سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ خلق قرآن کے مسئلے میں اُن پر تشدد ہو رہا تھا اور پیٹھ پر کوڑے برس رہے تھے، ایسے کوڑے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب فضل الفقر عن عمران بن حصین رضی اللہ عنہ و صحیح مسلم، کتاب الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ وَالِاسْتِغْفَارِ، باب أَكْثَرُ أَهْلِ الْجَنَّةِ الْفُقَرَاءُ وَأَكْثَرُ أَهْلِ النَّارِ النِّسَاءُ، عَنْ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

(۲) سنن الترمذی، کتاب الزهد عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، باب مَا جَاءَ أَنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِينَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ قَبْلَ أَغْنِيَائِهِمْ، عَنْ ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

(۳) سنن الترمذی، کتاب الزهد عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَاب مَا جَاءَ فِي ذَهَابِ الْبَصَرِ، عَنْ جابر رضی اللہ عنہ

کہ اگر ہاتھی کو مارے جاتے تو وہ بھی بلبلا اٹھتا، لیکن آپ نے اِس پر نہ اُف کی اور نہ آنسو بہائے۔ پھر وہ وقت آیا کہ نئے خلیفہ نے تلافی کے لیے آپ کے گھر پر اشرفیوں کا بھرا ہوا تھیلا بھیجا تو آپ رونے لگے اور فرمایا اے اللہ! میں اس آزمائش کا اہل نہیں ہوں، یہ زیادہ بڑی آزمائش ہے، اِس میں کامیاب ہونا زیادہ مشکل ہے۔

البتہ اِس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ ہم دعا کریں کہ اے اللہ ہمیں بھی صبر کے امتحان میں ڈال دے۔ ایسی آرزو کرنا اپنے آپ کو بہادر ظاہر کرنے کے مترادف ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی مشکل آجائے اور ہم صبر نہ کر سکیں۔ اللہ سے ہمیشہ عافیت ہی مانگنی چاہیے۔ البتہ اگر کوئی تکلیف آہی جائے، کوئی صدمہ پہنچ ہی جائے یا کوئی نقصان ہو ہی جائے تو آدمی اُس پر یہ سوچ کر صبر کر لے کہ اِس امتحان کا اجر اللہ کے ہاں زیادہ ہے، اگر میں اِس پر صبر کر لوں اور اللہ سے کوئی شکوہ و شکایت نہ کروں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

سَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا وَهُوَ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الصَّبْرَ فَقَالَ ﷺ قَدْ سَأَلْتَ اللهَ الْبَلَاءَ فَسَلْهُ الْعَافِيَةَ[1]

"نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو سنا جو یوں دُعا کر رہا تھا: "اے اللہ! مجھے صبر دے"۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تم نے اللہ سے آزمائش مانگی ہے۔ پس اللہ سے عافیت کا سوال کرو"۔

مسنون دعا ہے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَأَهْلِيْ وَمَالِيْ[2]

اے اللہ میں آپ سے عفو اور عافیت کا سوال کرتا ہوں اپنے دین میں اپنی دنیا میں اپنے گھر والوں میں اور اپنے مال میں۔

- لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ "تاکہ تم افسوس نہ کرو اُس پر جو شے تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے" کے الفاظ رہنمائی کر رہے ہیں کہ مذکورہ بالا حقائق کا ادراک ہو تو انسان کسی عزیز کے انتقال، کسی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ، بَاب مَا جَاءَ فِي عَقْدِ التَّسْبِيحِ بِالْيَدِ، و مسند احمد، کتاب مُسْنَدُ الْأَنْصَارِ، باب حَدِيثُ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضی اللہ عنہ

(۲) سنن ابی داؤد، ابواب النَّوْمِ، بَاب مَا يَقُولُ إِذَا أَصْبَحَ، عن عَبْدِ اللهِ بن عُمَرَ رضی اللہ عنہ

مالی نقصان اور کسی موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا ایسا تاثر نہیں لیتا کہ اپنے بال نوچے، گریبان پھاڑے، سر دیوار سے ٹکرائے، سر پر خاک ڈالے، نوحے یا مرثیے پڑھے، اللہ سے شکوے کرے یا زمانے کو موردِ الزام ٹھہرائے کہ:

ہاں اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مذکورہ بالا حقائق کا شعور بندۂ مومن میں تسلیم و رضا کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اِس کے برعکس ایک عام انسان کی نگاہ صرف اسباب پر ہوتی ہے اور وہ اچھے یا برے حالات کا بہت زیادہ تاثر لیتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا

(بنی اسرائیل 17: 83)

"اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو اعراض کرتا ہے اور پہلو پھیر لیتا ہے اور جب اُسے سختی پہنچتی ہے تو نا امید ہو جاتا ہے"۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾

(المعارج 70: 19-21)

"کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ جب اُسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے"۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ وَلَا تَعْجَزْ وَاِنْ اَصَابَكَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ اَنِّیْ فَعَلْتُ کَانَ کَذَا وَکَذَا وَلٰکِنْ قُلْ: قَدَرُ اللّٰہِ وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ(۱)

"اُس شے کی حرص کرو جو تمہیں فائدہ دے اور اللہ سے مدد طلب کرو اور ہمت نہ ہارو اور اگر تمہیں کچھ (نقصان) پہنچ جائے تو یہ مت کہو کہ اگر میں ایسا کر لیتا تو ایسا ہو جاتا۔ البتہ یہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب القدر، باب فِی الْاَمْرِ بِالْقُوَّۃِ وَتَرْكِ الْعَجْزِ...، عَنْ اَبِی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

کہو کہ اللہ کی تقدیر یہی تھی اور جو اُس نے چاہا، کر دیا کیوں کہ 'اگر' کا لفظ (کلمۂ لو) شیطان کے کام کا دروازہ کھول دیتا ہے"۔

رضائے حق پہ راضی رہ یہ حرفِ آرزو کیسا
خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم تو کیسا

تسلیم و رضا کی کیفیت کا مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے اِن اشعار میں کیا خوب اظہار ہے جو اُنہوں نے اپنی بیٹی کے نام جیل سے لکھے تھے، جب وہ ٹی بی کے مرض میں مبتلا تھی:

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اِک حال میں امید سے مامور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

- اللہ اور تقدیر پر ایمان انسان کو داخلی امن و سکون دیتا ہے کیونکہ ایمان کے معنی ہیں امن دینا۔ بندۂ مومن کبھی بھی غم کو گلے کا ہار نہیں بناتا اور نہ ہی اُس کی طبیعت اِس طرح بجھ کر رہ جاتی ہے کہ وہ مستقل مایوسی (Depression) کا شکار ہو جائے اور اُس کی کمرِ ہمت ٹوٹ کر رہ جائے۔

- اِن آیات میں کسی صدمے پر فوری اور غیر اختیاری تاثر کی نفی نہیں بلکہ اُس مستقل تاثر کی نفی ہے جس سے زبان پر شکوہ اور دل میں رب سے بد گمانی کا شائبہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر وقتی طور پر انسان مغموم ہو اور آنکھوں سے آنسو بہہ جائیں تو یہ کیفیات ایمان کے منافی نہیں ہیں۔ بخاری و مسلم میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے پر نزع کا وقت قریب آیا تو اُنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تشریف لانے کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیجا:

إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ

"اللہ تعالیٰ کسی سے جو کچھ لے وہ بھی اُسی کا ہے، اور کسی کو جو کچھ دے وہ بھی اُسی کا ہے، الغرض ہر چیز ہر حال میں اُسی کی ہے (اگر کسی کو دیتا ہے تو اپنی چیز دیتا ہے اور کسی سے لیتا ہے تو اپنی چیز واپس لیتا ہے) اور ہر چیز کے لیے اُس کی طرف سے ایک مدت اور وقت مقرر ہے (اور اُس وقت کے آجانے پر وہ چیز اِس دنیا سے اٹھالی جاتی ہے) پس چاہیے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اِس صدمے کے اجر و ثواب کی طالب بنو"۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے قسم دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ ضرور تشریف لائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اپنی صاحبزادی کے ہاں پہنچے۔ بچہ اٹھا کر آپ کی گود میں دیا گیا۔ اُس کا سانس اُکھڑ رہا تھا۔ اِس حال میں بچے کو دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اِس پر حضرت سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ نے حیرت سے عرض کیا: یہ کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِي قُلُوْبِ عِبَادِهٖ وَاِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ[1]

"یہ رحمت کے اُس جذبہ کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے اور اللہ کی رحمت اُن ہی بندوں پر ہو گی جن کے دلوں میں رحمت کا یہ جذبہ ہو (اور جن کے دل سخت اور رحمت کے جذبے سے بالکل خالی ہوں، وہ خدا کی رحمت کے مستحق نہ ہوں گے)"۔

اِسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ پر نزع کا عالم طاری ہوا تو اُن کو دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ کی یہ کیفیت؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ[2]

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب قَوْلِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم يُعَذَّبُ الْمَيِّتُ بِبَعْضِ بُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ، و صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الْبُكَاءِ عَلَى الْمَيِّتِ، عَنْ اسامة بن زيد رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب قَوْلِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم إِنَّا بِكَ لَمَحْزُونُونَ، عَنْ انس بن مالك رضی اللہ عنہ

"آنکھ آنسو بہاتی ہے دل مغموم ہے اور زبان سے ہم وہی کہیں گے جو اللہ کو پسند ہو (یعنی اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرۃ 2: 156)) اور اے ابراہیم تمہاری جدائی کا ہمیں صدمہ ہے"۔

- وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ "اور نہ اتراؤ اُس پر جو تم کو وہ (اللہ) عطا کرے" کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ کسی نعمت کے ملنے پر خوشی و مسرت کا اظہار کرنا ایک فطری عمل ہے اور یہ ایمان کے منافی نہیں ہے۔ البتہ ایسے موقع پر خوشی کی وجہ سے پھولے نہ سمانا اور اترانا ایمان کے منافی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان حصولِ نعمت کو اپنی صلاحیت اور کاوشوں کا نتیجہ سمجھتا ہے لہٰذا اُس میں خود پسندی اور اپنی بڑائیاں کرنے کی برائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی لیے فرمایا: وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ "اور اللہ پسند نہیں کرتا خود کو کچھ سمجھنے والے اور بڑائی کرنے والے کو"۔

- درحقیقت جتنا انسان ایمان سے دور ہو گا اتنا ہی اِن غم اور خوشی کی کیفیات میں اعتدال سے ہٹتا چلا جائے گا۔ جتنا انسان حقائق سے قریب تر آئے گا، ایمان سے بہرہ ور ہو گا، معرفتِ ربانی سے حصہ پائے گا، اتنا ہی اِن دونوں کیفیات کے مابین فاصلہ کم سے کم تر ہوتا چلا جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (التغابن 64: 11)

"کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ کے حکم سے اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اُس کے دل کو (تسلیم و رضا کی) ہدایت دیتا ہے اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے"۔

اگر انسان کا دل نورِ ایمان سے منور ہے تو پھر کشادگی ہو یا تنگی، مسرت بخش صورتِ حال ہو یا تکلیف دہ کیفیت، اِن سب کے مابین انسان کی معنوی شخصیت ایک چٹان کے مانند کھڑی ہو گی:

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

- راضی برضائے رب ہونا بندۂ مومن کی صفت ہے لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ماضی سے سبق حاصل نہ کیا جائے، مجرموں کو سزا نہ دی جائے، ظلم و استحصال کو تقدیر سمجھ کر اُن کے خلاف

علمِ جہاد بلند نہ کیا جائے اور ظالموں سے بدلہ نہ لیا جائے۔ راضی برضائے رب ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اللہ سے کسی قسم کا سوئے ظن نہ رکھے اور اُس کے کسی فیصلہ پر عدم اعتماد اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کرے۔

آیت 24:

اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ ...جو بخل کرتے ہیں... وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ... اور لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں... وَ مَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴿۲۴﴾ اور جس نے رُخ پھیر لیا تو بے شک اللہ کسی کا محتاج نہیں اور بذاتِ خود محمود ہے۔

- اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ "جو بخل کرتے ہیں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمانی حقائق سے دور اور محروم ہیں۔ وہ دنیوی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھتے ہیں، یہاں کے برے حالات کا شدید تاثر لیتے ہیں اور یہاں کی نعمتوں کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتے ہیں۔ سورۃ الھمزۃ[104] کی آیات 1-3 میں اِس طرح کے کردار کو یوں بیان کیا گیا:

  وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗۙ﴿۲﴾ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗۚ﴿۳﴾

  "خرابی ہے ہر طعنہ دینے اور چغلی کھانے والے کے لیے، جو مال جمع کرتا اور اُسے گن گن کر رکھتا ہے (اور) خیال کرتا ہے کہ اُس کا مال اُسے ہمیشہ زندہ رکھے گا"۔

- سورۂ حدید کی آیت 18 میں ہم سمجھ چکے ہیں کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا انسان کے دل کو ایمان کے نور سے منور کرتا ہے۔ اِس کے برعکس مال روک روک کر رکھنا انسان کے دل میں نفاق پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کے حامل حضرات خود تو نیک کاموں سے محروم ہوتے ہی ہیں لیکن ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی نیک کاموں سے منع کرتے ہیں۔ اِسی لیے اِس آیت کے اگلے حصے میں فرمایا وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ "اور وہ لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں"۔ جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں اُنہیں آگے بڑھنے والے کبھی اچھے نہیں لگتے۔ اُن کے آگے بڑھ جانے سے پیچھے رہ جانے والوں کی کمزوری زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ دوسرے ساتھیوں کو بھی دین کے لیے قربانی دینے سے روکتے ہیں تا کہ وہ بھی اِن ہی کی طرح ہو جائیں۔

اگر کوئی اللہ کا بندہ دین کی راہ پر آگے بڑھنا چاہتا ہے اور اُس میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ ابھرتا ہے تو سرمایہ دارانہ ذہنیت کے حاملین بظاہر بڑے خیر خواہ بن کر ہمدردی کے انداز میں کہتے ہیں، میاں ہوش کے ناخن لو، کہاں جا رہے ہو، کیا کر رہے ہو، کچھ مستقبل کی فکر کرو، کچھ آئندہ کے لیے بچت کے بارے میں سوچو، بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں تم پر۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں، کل بڑے ہوں گے، اِن کی ذمہ داریاں تم نے ادا کرنی ہیں۔ زیادہ جذباتی نہ بنو۔ کچھ اپنے خیر و شر اور نفع و نقصان کا خیال کرو۔

- آیت کے آخر میں فرمایا وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ "اور جس نے رُخ پھیر لیا تو بے شک اللہ کسی کا محتاج نہیں اور بذاتِ خود محمود ہے"۔ یہ اللہ کی طرف سے بڑا دو ٹوک انداز ہے۔ اتنی واضح آیات سامنے آنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص دنیوی زندگی اور اِسی کی نعمتوں کو اہمیت دے رہا ہے تو وہ کان کھول کر سن لے کہ اللہ کو کسی کی نیکی، ایثار، قربانی اور انفاق کی کوئی احتیاج نہیں۔ اللہ کا کوئی کام تمہارے جہاد یا انفاق نہ کرنے سے رکا ہوا نہیں۔ حدیثِ قدسی ہے:

يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ- كَانُوا عَلٰى اَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْكُمْ- مَا زَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئاً- يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ- وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ- كَانُوْا عَلٰى اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ- مَّا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئاً- يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ- وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ- قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ فَسَئَلُوْنِيْ- فَأَعْطَيْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَسْئَلَتَهٗ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ اِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ[1]

"اے میرے بندو! اِس میں شک نہیں کہ اگر تم سب اولین و آخرین، جن و انس اپنے میں سے سب سے زیادہ متقی آدمی کے موافق اپنے دل بنالو تو (تم سب کا) یہ تقویٰ میری خدائی میں ذرا اضافہ نہ کر سکے گا۔ اے میرے بندو! اگر تم سب اولین و آخرین، جن و انس میں سے سب سے زیادہ گناہ گار آدمی کے دل کے موافق اپنا دل بنالو تو (تم سب کا) یہ گناہ گار

(1) صحیح مسلم، کتاب البِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَاب تَحْرِيمِ الظُّلْمِ، عَن ابی ذرؓ

ہونا میری خدائی میں سے ذرا بھی کمی نہیں کر سکتا۔ اے میرے بندو! اگر تم اولین و آخرین، جن و انس سب مل کر ایک میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے سوال کرو اور میں ہر شخص کا سوال پورا کر دوں تو (سب کا سوال پورا کرنے پر) میرے خزانوں میں سے صرف اتنی سی کمی آئے گی جتنا کہ سوئی کو سمندر میں ڈبو کر باہر نکالا جائے"۔

بلاشبہ انسان اللہ کا ہر گھڑی محتاج ہے۔ یہ اُس کی ضرورت ہے کہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے اللہ کی راہ میں مال اور جان لگائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اِس کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی گمراہی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

سورۃ الحدید حصّہ ششم: آیت 25

تمام رسولوں کا مشن-نظامِ عدل کا قیام

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۵

یہ سورۃ الحدید کی وہ اہم ترین آیت ہے جس میں انقلابی مضمون اپنے عروج پر بیان ہوا ہے۔ انقلاب کہتے ہیں کسی معاشرے میں رائج نظام کی تبدیلی کو۔ ظاہر ہے اِس کے لیے رائج الوقت نظام کو پہلے تلپٹ کرنا پڑتا ہے اور پھر اُس کی جگہ نیا نظام آتا ہے۔ انقلاب لانے کے لیے پہلے وعظ، نصیحت، تلقین اور تبلیغ کی جاتی ہے لیکن اِس کے بعد ایک مرحلہ آتا ہے جہاں طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ تلقین و تعلیم، وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں تمام طبقات سے نیک سرشت لوگ دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ انقلابی دعوت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں جن کے مفادات رائج الوقت نظام کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے معاشرے میں جاگیر دار پورے علاقے کا مالک اور بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں پر بسنے والے لوگ اُس کے کمّی کاری اور اُس کی رعیت شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جاگیر دار کبھی بھی برداشت نہیں کرے گا کہ جاگیر دارانہ نظام ختم ہو جائے۔ وہ مخالفت کرے گا اور پھر اُس کے خلاف طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ یہ بات کہنا آسان نہیں ہے۔ جنگ اور خون ریزی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بات اور صرف دعوت و تبلیغ کے بیان ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سورۂ حدید کی اِس آیت مبارکہ میں اِس تلخ حقیقت کو بالکل کھلے انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ ... بلاشبہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں علیہم السلام کو واضح نشانیوں کے ساتھ ...

وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ ... اور ہم نے نازل کیں اُن کے ساتھ کتابیں اور ترازو (نظام

عدل)... لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ... تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں... وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ... اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے... وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ... اور لوگوں کے لیے دیگر فائدے بھی ہیں... وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ ... تاکہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون غیب میں رہتے ہوئے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے... اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ بے شک اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔

مناسب ہو گا کہ اِس آیت میں بیان کیے گئے مضامین پر تفصیلی غور و فکر کیا جائے۔

((لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ))

"بلاشبہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں علیہم السلام کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے نازل کیں اُن کے ساتھ کتابیں اور ترازو"۔

- آیت کے اِس حصے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اِس آیت کا سورۃ الصف[61] کی مرکزی آیت یعنی آیت 9 کے ساتھ تقابلی مطالعہ کریں۔ سورۃ الحدید کی اِس آیت میں تمام رسولوں کا مقصدِ بعثت بیان کیا گیا ہے جبکہ سورۃ الصف[61] کی آیت 9 میں نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان کیا گیا:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو کامل ہدایت کے ساتھ اور سچے دین کے ساتھ تاکہ وہ اُسے غالب کر دیں کل نظامِ زندگی پر چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے"۔

مذکورہ بالا دونوں آیات کے تقابلی مطالعے سے حسبِ ذیل اہم نکات کا فہم حاصل ہوتا ہے:

1. سورۃ الحدید کی آیت میں الفاظ آئے لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا "بلاشبہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں علیہم السلام کو"۔ سورۃ الصف کی آیت میں فرمایا هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو"۔ روئے ارضی پر قافلۂ انسانیت اور قافلۂ نبوت و رسالت نے بیک وقت سفر شروع کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور

پہلے نبی بھی۔ قافلۂ انسانیت بھی ارتقائی مراحل طے کرتا رہا اور قافلۂ نبوت بھی۔ تمام رسولوں کا مقصد بعثت تھا قیامِ عدل ۔ یہ مقصد ایک اتمامی اور تکمیلی شان اختیار کر گیا رسالتِ محمدی ﷺ میں جس کا ذکر سورۂ صف کی آیت 9 میں ہے۔

2. سورۃ الحدید کی آیت 25 میں فرمایا کہ تمام رسول بینات اور کتابیں لے کر آئے۔ کتاب کا لفظ عام فہم اور واضح ہے۔ البتہ بینات کا مفہوم وضاحت طلب ہے۔ بینات جمع ہے بینۃ کی اور بینۃ مؤنث ہے بین کی۔ بین کہتے ہیں ایسی چیز یا دلیل کو جو بالکل واضح ہو۔ یہ لفظ دو اعتبارات سے انبیاء و رسل علیہم السلام کے بارے میں آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جو تعلیمات وہ لے کر آئے اور جن باتوں کو ماننے کی اُنہوں نے دعوت دی وہ بالکل واضح اور روشن ہیں۔

دوسرے معجزات جو نبوت و رسالت کا واضح ثبوت ہوتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے لیے اللہ نے کتاب اور معجزے کو جمع فرما دیا۔ آپ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہی ہے جس کی نظیر پیش کرنے کا قرآن نے کئی بار چیلنج دیا اور جو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اِسی لیے سورۂ صف کی آیت میں بینات اور کتابوں کی جگہ الہدیٰ آیا ہے جو قرآنِ حکیم ہی کا ایک صفاتی نام ہے۔

3. سورۃ الحدید کی آیت میں فرمایا کہ اللہ نے رسولوں کے ساتھ میزان نازل کیا۔ میزان وزن سے بنا ہے یعنی تولنے والی شے جسے ہم ترازو کہتے ہیں۔ اِس کے دونوں پلڑے برابر ہوتے ہیں، اِن میں توازن ہوتا ہے، اِسی سے مفہوم پیدا ہوا توازن کا۔ سورۃ الصف کی آیت میں میزان کے مقابل دینِ حق یعنی عادلانہ نظام کی اصطلاح وارد ہوئی ہے۔ گویا میزان وہ نظام فکر و عمل ہے جس میں توازن پایا جائے۔ جس میں ہر ایک کے حقوق و اختیارات کا عدل کے ساتھ تعین ہو جائے۔ انسانی تمدن کے بعض مسائل بہت پیچیدہ ہیں جیسے مرد و عورت، والدین و اولاد، سرمایہ و محنت اور فرد و اجتماعیت کے مابین حقوق اور اختیارات کا معاملہ۔ عادلانہ نظام وہ ہے جو اِن پیچیدہ مسائل کے لیے متوازن رہنمائی فراہم کرے۔ اللہ نے اپنے آخری رسول ﷺ کو وہ نظامِ حق دیا جو زندگی کے جملہ

پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اور جس میں انسانی تمدن کے تمام پیچیدہ مسائل کا متوازن حل موجود ہے۔

((لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ))

"تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں"۔

- آیت کے اِس حصے میں اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کی بعثت کا مقصد بتایا ہے قیامِ عدل۔ اِس کے مقابل سورۃ الصف[61] کی آیت 9 میں فرمایا لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ "تاکہ رسول ﷺ غالب کر دیں دینِ حق کو کل نظامِ زندگی پر"۔ گویا قیامِ عدل کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کر دیا جائے۔
- سورۃ الحدید کی آیت کے اِس حصے سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے کہ اِس دنیا میں اعلیٰ ترین مشن کیا ہو سکتا ہے؟ دنیا میں بھلائی کے کام کئی نوعیت کے ہو سکتے ہیں مثلاً خدمتِ خلق، اصلاحِ معاشرہ، اصلاحِ رسومات، اصلاحِ عقائد، تعلیمی و تدریسی خدمت اور تزکیۂ نفس کا کام۔ بلاشبہ اللہ کے رسولوں نے مذکورہ بالا خیر کے کام بھی کیے لیکن اُن کے ساتھ ساتھ دنیا میں عدل کا قیام بھی کیا۔ اُنہیں کتاب صرف اِس لیے نہیں دی گئی تھی کہ اُس کی تلاوت کے ذریعے حصول ثواب یا ایصالِ ثواب کر لیا جائے بلکہ مقصود یہ تھا کہ کتاب کی تعلیمات پر مبنی عادلانہ نظام قائم کیا جائے۔ شریعت کی میزان اللہ نے اِس لیے عطا فرمائی کہ اُسے نصب کیا جائے۔ بہترین نظامِ عدل وقسط اگر کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو بے معنی ہے جب تک کہ وہ بالفعل نافذ نہ ہو۔
- قیامِ عدل ہی دینِ اسلام کا ایک امتیازی وصف (Catch word) ہے۔ اِس حوالے سے مندرجہ ذیل نکات قابلِ توجہ ہیں:

1. سورۃ آلِ عمران[3] آیت 18 میں بڑے جلالی اسلوب میں قیامِ عدل کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی شان قرار دیا گیا:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

"گواہی دیتا ہے اللہ کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحبانِ علم، قائم کرنے والا ہے عدل کا، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، زبردست ہے بڑی حکمت والا"۔

2. قرآنِ حکیم میں تین بار (المائدۃ[5]:42، الحجرات[49]:9، الممتحنۃ[60]:8) یہ الفاظ آئے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ "بے شک اللہ محبت کرتا ہے عدل کرنے والوں سے"۔

3. اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا تعلق عدل سے ہے یعنی "العدل"، "العادل" اور "المقسط"۔ "العدل" مصدر ہے اور یہ لفظ صفت کے طور پر نہیں آتا لیکن اللہ کا یہ بھی ایک صفاتی نام ہے۔ گویا اللہ سراپا عدل ہے۔

4. قرآنِ حکیم میں اہلِ ایمان کو عدل کرنے اور اِس کا علمبردار بننے کا حکم دیا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء[4]:58)

"بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت حوالے کر دو اُس کے جو اِس کا حق دار ہے اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو فیصلہ کیا کرو عدل کے ساتھ"۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ (النساء[4]:135)

"اے ایمان والو! ہو جاؤ عدل پر قائم ہونے والے اور گواہ اللہ کے لیے، خواہ (اِس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو"۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدۃ[5]:8)

"اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے عدل کی گواہی دینے والے بن کر اور لوگوں کی دشمنی تمہیں اِس بات پر آمادہ نہ کرے کہ عدل چھوڑ دو (بلکہ) عدل کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے"۔

5. سورۃ الشوریٰ[42] آیت 15 میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ اعلان کر دیجیے:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ

"اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں"۔

6. اِس دنیا میں عادلانہ نظام کا قیام اعلیٰ ترین خدمتِ خلق ہے۔ ظالمانہ نظام مسلسل مظلوم پیدا کرتا رہتا ہے اور اِس کے تحت سماجی خدمت کے کاموں سے محض چند مظلوموں کی دادرسی ہوتی ہے۔ پائیدار خدمتِ خلق یہ ہے کہ مظلوم پیدا کرنے والے نظام ہی کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔

7. عادلانہ نظام کا قیام دنیا اور آخرت دونوں اعتبار سے انسانوں کے لیے رحمت ہے۔ دنیا میں سکون محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہمارا استحصال نہیں کر رہا اور ہمارے حقوق ہمیں حاصل ہو رہے ہیں۔ اِس پُر سکون ماحول ہی میں انسان آخرت کی تیاری کے لیے اپنے مقصدِ زندگی یعنی اللہ کی عبادت کے لیے بھی یکسو ہو سکتا ہے۔ اِس کے برعکس ظالمانہ نظام خالق و مخلوق کے درمیان سب سے بڑا پردہ بن جاتا ہے اور آخرت کی تیاری کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اِس نظام میں انسانوں کی ایک عظیم اکثریت حیوانوں کی سطح پر آجاتی ہے۔ اُن کی زندگی کا صرف ایک مقصد رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کسی طرح اپنے لیے دو وقت کی روٹی اور ضروریاتِ زندگی کا سامان پورا کر سکیں۔ اب اُن کے لیے کہاں اِس کا موقع ہے کہ وہ دینی تقاضے ادا کریں، اللہ سے لو لگا کر لذتِ مناجات اور حلاوت دعا کی سعادت حاصل کر کے آخرت کی تیاری کر سکیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ایک دو دھاری تلوار کی طرح انسانوں کا استحصال کرتی ہے۔ اِس سے انسانوں کی دنیا و آخرت دونوں ہی برباد ہو جاتی ہیں۔ سرمایہ داروں کا طبقہ مالِ حرام پر عیش تو کرتا ہے لیکن روحانی سکون سے محروم ہو جاتا ہے اور عیش میں یادِ خدا اور فکرِ آخرت سے غافل رہتا ہے۔ پھر حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق حرام کمائی سے پلنے والا جسم جہنم ہی میں جانے کا حق دار ہے[1]۔ دوسری طرف غریب کو ضروریاتِ زندگی کی فکر نہ صرف ہر وقت ستائے

(1) مسند احمد، باقی مسند المکثرین، مسند جابر بن عبد اللہ، عن جابر رضی اللہ عنہ

رکھتی ہے بلکہ آخرت کی تیاری سے بھی بیگانہ رکھتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ سکتی ہے کہ حدیثِ نبوی ﷺ كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُونَ كُفْرًا[1] (قریب ہے کہ فقر، کفر تک پہنچ جائے) کے مصداق انسان کو مایوسی کفر تک لے جاتی ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ وہ نظامِ عدل و قسط قائم کیا جائے جس میں ہر ایک کو اُس کا جائز حق ملے، کوئی کسی دوسرے کے حق پر دست درازی نہ کر سکے، وسائل اور دولت کی تقسیم منصفانہ ہو، مواقع ہوں تو سب کے لیے یکساں ہوں، تمیزِ بندہ و آقا ختم ہو جائے، کوئی کسی کے تحت دبا اور کچلا ہوا نہ ہو اور سب انسان واقعی آپس میں بھائی بھائی اور اللہ کے بندے بن جائیں۔

((وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ))

"اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دیگر فائدے بھی ہیں"

- آیت کے اِس حصے میں لوہے کی افادیت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ بلاشبہ لوہا کئی مفید اشیاء مثلاً کئی قسم کے آلات، ذرائع آمد و رفت، برتن، فرنیچر اور دیگر ضروریاتِ زندگی بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اِس کی اصل خوبی یہ ہے کہ اِس میں اللہ نے شدید قوتِ حرب و ضرب رکھی ہے اور اسلحہ و دیگر عسکری ساز و سامان کی تیاری میں یہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

- آیت کے اِس حصے میں دراصل اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نظامِ عدل کا قیام پُر امن طریقۂ کار سے ممکن نہیں، اِس کے لیے تصادم ناگزیر ہے اور لوہے کی عسکری خوبی کو بروئے کار لاتے ہوئے طاقت کا استعمال لازماً کرنا پڑے گا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ظالمانہ اور استحصالی نظام ازخود جڑیں نہیں چھوڑا کرتا۔ اِس نظام سے با اختیار طبقے کے کچھ مفادات اور چودھراہٹیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ طبقہ دوسروں کے حقوق غصب کر کے عیاشی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ طبقہ آسانی سے اپنے مفادات سے دستبردار نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی تحریک اِس طبقے

---

(1) شعب الإيمان للبيهقي، باب في الحث على ترك الغل والحسد، عَنْ انسِ بنِ مالكٍ رضی اللہ عنہ

کے ظلم کو ختم کرنے کے لیے اُٹھتی ہے تو یہ طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اِس تحریک کو کچلنے کے لیے پوری قوت صرف کرتا ہے اور یوں مسلح تصادم کا مرحلہ آکر رہتا ہے۔

- مسلح تصادم کی نوبت انقلابی عمل کے دوران آخری مرحلے کے طور پر آتی ہے۔ پہلے دعوت دی جاتی ہے اور بات سمجھانے کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ اِس دوران مخالفت کے جواب میں کسی ردعمل کا مظاہرہ نہ کر کے یعنی Passive resistance کے ذریعے مخالفین پر ایک اخلاقی اثر بھی ڈالا جاتا ہے۔ اب جن لوگوں کے دل میں واقعی خیر ہوتا ہے وہ وعظ و نصیحت اور انقلابی جماعت کے اخلاقی طرزِ عمل سے متاثر ہو کر انقلابی دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ البتہ جو لوگ ابو جہل کی طرح لاتوں کے بھوت ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ مسلح تصادم کا مرحلہ آتا ہے اور اُن کے خلاف لوہے کی طاقت استعمال کی جاتی ہے تاکہ قیامِ عدل کا مشن پورا کیا جا سکے۔

- اگر مقصد صرف افراد کی اصلاح اور اُن کا تزکیۂ نفس ہو تو پھر درس گاہیں اور خانقاہیں بنا کر بھی مقصد پورا کیا جا سکتا ہے۔ مخالفت اِس کام میں بھی ہو سکتی ہے لیکن اِسے جھیل کر کام جاری رکھا جا سکتا ہے اور کسی خون ریزی کی نوبت نہیں آتی۔ البتہ اگر اس کے ساتھ ساتھ ظالمانہ نظام کو ملیامیٹ کر کے عادلانہ نظام کو قائم کرنا پیش نظر ہو تو پھر میدان میں آنا پڑے گا، باطل سے پنجہ آزمائی کرنی پڑے گی اور جان کی بازیاں لگانی پڑیں گی۔ نظام کی تبدیلی مسلح تصادم کے بغیر ممکن نہیں۔ اِسی لیے اللہ نے قرآنِ حکیم میں اپنے محبوب بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے خاص طور پر اُن کی اللہ کی راہ میں لڑنے کی شان کو نمایاں کیا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (الصف 61:4)

"بلاشبہ اللہ تو محبت کرتا ہے اُن سے جو جنگ کرتے ہیں اُس کی راہ میں جم کر صف در صف گویا کہ وہ ہیں سیسہ پلائی ہوئی دیوار"۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران 3:146)

"اور کتنے ہی نبی علیہم السلام ایسے گزرے ہیں کہ جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو اُنہوں نے ہمت نہ ہاری اُن تکالیف پر جو اُنہیں اللہ کی راہ میں پیش آئیں، نہ وہ

کمزور پڑے اور نہ باطل کے سامنے دبے اور اللہ ایسے ہی صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (الاحزاب 33:23)

"مومنوں میں وہ جواں مرد بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا وہ عہد جو اُنہوں نے اللہ سے کیا تھا تو اُن میں کچھ ایسے ہیں جو اپنی نذر (جان) پیش کر چکے اور کچھ ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں اور اُنہوں نے (اپنے عہد کی بات کو) ذرا بھی نہیں بدلا"۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ (التوبۃ 9:111)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جانیں اور مال خرید لیے ہیں جنت کے عوض وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، قتل کرتے ہیں (کافروں کو) اور قتل کیے جاتے ہیں"۔

نبی اکرم ﷺ نے جھنجھوڑنے کے انداز میں فرمایا:

مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ، مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِفَاقٍ(1)

"جس کی موت اِس حال میں واقع ہوئی کہ نہ اُس نے کبھی (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ ہی اُس کے دل میں اِس کی آرزو پیدا ہوئی تو اُس کی موت ایک طرح کے نفاق پر واقع ہوئی"۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

- آیت کے اِس حصے سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نظام کی تبدیلی کسی پُر امن طریقہ کار سے ممکن نہیں۔ ایک رائے یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہم محض تبلیغ کے ذریعے ہی خاموش انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ اِسی طرح یہ بھی تصور ہے کہ انتخابی سیاست میں حصہ لے کر بھی انقلاب لایا جا سکتا

(1) صحیح مسلم، کتاب الْاِمَارَةِ، بَاب ذَمِّ مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهٗ بِالْغَزْوِ، عَنْ ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

ہے۔ تجربات شاہد ہیں کہ استحصال اور جبر کرنے والے طبقات کبھی بھی پُر امن طور پر اپنے مفادات چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ بقول شاعر:

زورِ بازو آزما، شکوہ نہ کر صیاد سے
آج تک کوئی قفس ٹوٹا نہیں فریاد سے

تاریخِ انسانی میں آج تک کوئی انقلاب بغیر مسلح تصادم کے نہیں آیا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو رحمۃ للعالمین جنابِ نبی کریم ﷺ تلوار تو کجا ایک چھڑی تک اپنے ہاتھ میں نہ لیتے اور صرف اپنی موثر تبلیغ کے ذریعے ہی حق کو غالب فرما دیتے، لیکن آپ ﷺ کو بھی غلبۂ دین کے لیے تلوار اٹھانا پڑی اور اپنے انتہائی محبوب اور تربیت یافتہ ساتھیوں رضی اللہ عنہم کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔

- آیت کا یہ حصہ اُس مغالطے کا بھی ازالہ کرتا ہے جو مستشرقین کو نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے حوالے سے محسوس ہوتا ہے۔ اُنہیں آپ ﷺ کی مکی زندگی تو نبوی نظر آتی ہے لیکن مدنی زندگی میں آپ ﷺ کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر انتشارِ ذہنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سن 6 ہجری میں بظاہر دب کر صلح حدیبیہ کرتے ہوئے وہ آپ ﷺ کو نبوی رنگ میں دیکھتے ہیں لیکن سن 8 ہجری میں ابوسفیان کی عاجزانہ درخواست کے باوجود آپ ﷺ کی طرف سے صلح کی تجدید نہ کرنا اُنہیں سمجھ نہیں آتا۔ حالانکہ بات واضح ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد تھا عادلانہ نظام کا قیام۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے جس وقت جو طرزِ عمل مفید تھا آپ ﷺ نے اُسی کو اختیار فرمایا۔ اِس مقصد کے لیے ابتدا میں دعوت و تبلیغ کی جاتی ہے اور برائی کا جواب اچھائی سے دیا جاتا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

(حٰمٓ السجدۃ 41:34)

"جواب دو (بدی کا) اُس طور پر جو بہت اچھا ہو۔ تو وہ کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے ایسے ہو جائے گا جیسے گرم جوش دوست"۔

البتہ جو لوگ تبلیغ کے ذریعے حق قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور ظلم کا بازار گرم رکھنا چاہتے ہیں، تو پھر اُن کی برائی کا جواب ویسی ہی برائی سے دیا جاتا ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ 42:40)

"اور بُرائی کا بدلہ تو اُسی طرح کی بُرائی ہے"۔

یہ ہے وہ توازن جو صرف دینِ اسلام کی امتیازی شان ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اصلاحِ حال کے لیے نرمی بھی ہے اور سختی بھی، عفو و درگذر بھی ہے اور قصاص بھی، تبشیر بھی ہے اور انذار بھی۔

دورِ حاضر میں انقلابی عمل

- دورِ حاضر میں مسلح تصادم کے حوالے سے کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے جس دائرۂ کار میں انقلاب کی تکمیل فرمائی، وہاں ایک منظم ریاست قائم نہ تھی۔ ہمیں اِس وقت ایک ایسے معاشرے میں کام کرنا ہے جہاں ایک ریاست منظم اور موثر طاقت کے ساتھ کار فرما ہے اور وہ نہ صرف اجتماعی بلکہ بعض اعتبارات سے انفرادی معاملات زندگی پر بھی حاوی ہے۔ پھر ریاست میں برسرِ اقتدار طبقے کے پاس اپنے قائم کردہ نظام کے تحفظ کے لیے ہر طرح کے اسباب و وسائل اور لاکھوں کی تعداد میں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس، ہمہ وقت اور تربیت یافتہ افواج موجود ہیں۔ دوسری طرف عوام بالکل نہتے ہیں۔ اِس وجہ سے حکومت کے خلاف کسی مسلح تصادم میں کامیابی کا امکان مشکل نظر آتا ہے۔

- مسلح تصادم کے حوالے سے مسلم معاشرے میں ایک اور مشکل یہ ہے کہ مقابلہ باطل نظام کے محافظ کلمہ گو مسلمانوں سے ہے۔ کلمہ گو مسلمان حکمرانوں سے تصادم کے لیے فقہاء نے دو شرائط بیان کی ہیں۔ پہلی یہ کہ حکمران کھلم کھلا کفر کا نفاذ کر رہے ہوں اور دوسری یہ کہ مناسب اسباب اِس حد تک فراہم کر لیے جائیں کہ فتح کا غالب امکان محسوس ہو۔ یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ موجودہ دور میں اسباب یعنی ہتھیاروں اور عسکری تربیت کے اعتبار سے حکومت اور عوام میں بہت زیادہ عدم توازن ہے اور حکومت کے ساتھ مسلح تصادم کی صورت میں فتح کا امکان معدوم نظر آتا ہے۔

- اِن حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ پُرامن اور غیر مسلح منظم احتجاج کے ذریعے طے کیا جا سکتا ہے۔ اِس احتجاج میں کسی ایسے منکر کے خلاف احتجاج کرنا ضروری ہو گا جس کا خلافِ

شرع ہونا تمام دینی طبقات کے نزدیک مسلم ہو۔ مثال کے طور پر عریانی و فحاشی کی اشاعت، سودی معیشت کی ترویج وغیرہ۔ ایسے منکر کے خلاف اقدام ریاست کے اہم اداروں کے پُر امن گھیراؤ اور سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اِن پُر امن اور منظم مظاہروں کے ذریعے سے حکومتِ وقت کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اُس منکر کا قلع قمع کرے اور اِس کے سدباب کے لیے قانون سازی کرے۔ یہ طریقہ حکومت کے خلاف بغاوت کا نہیں اور نہ ہی قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کا ہے۔ پھر اِس طریقے میں اقتدار کی طلب بھی نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں سے مسلم معاشرے میں منکرات کو ختم کرنے اور شریعتِ اسلامی کے مطابق قانون سازی کرنے کا مطالبہ ہے۔ اگر حکومت یہ مطالبہ نہیں مانتی تو پھر مظاہرین کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے، تشدد برداشت کرنے اور یہاں تک کہ جانیں قربان کرنے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔ یہ طرزِ عمل اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اُسوے پر چلنے والا ہو گا جنہوں نے مکی دور میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں لیکن جواب میں کوئی اقدام نہ کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹ کر صبر کا مظاہرہ کیا۔

- البتہ اِس طرح کے پُر امن احتجاج سے قبل ضروری ہے کہ:

1. انقلابی جماعت نے اپنے معاشرے میں دعوت کا حق ادا کیا ہو۔ بڑی وضاحت کے ساتھ اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کی فرضیت، اسلامی انقلاب کے برپا کرنے کی اہمیت اور اُس کی برکات لوگوں کے سامنے پیش کی ہوں۔ ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات واعتراضات کے جوابات دیے ہوں۔

2. انقلابی جماعت میں شامل کارکنان نے اپنے اپنے دائرہ کار میں شریعت کے احکامات پر امکانی حد تک عمل کر کے سیرت و کردار کا لوہا منوایا ہو۔ عوام الناس اُن کے قول و فعل کی مطابقت کے قائل ہوں۔ اُنہوں نے تزکیے کے مراحل طے کیے ہوں، اُن کا مطلوب و مقصود اللہ کی رضا کا حصول اور نجاتِ اخروی ہو اور اُن کے دل راہِ حق میں جان دینے کے لیے بے چین ہوں۔

3. انقلابی جماعت ایک شخص کی قیادت میں احکامات سننے اور ماننے کے اصول پر پوری طرح سے منظم ہو۔ مختلف مناصب پر تربیت یافتہ افراد فائز ہوں اور کارکنان، نظم کے خوگر ہونے کا ثبوت دے چکے ہوں۔

مندرجہ بالا مراحل طے کر کے ہی انقلابی جماعت کو انقلاب کے آخری مرحلے یعنی میدان میں آکر پُرامن احتجاج کا آغاز کرنا چاہیے۔

- پُرامن اور منظم احتجاج کے تین ممکنہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں:

1. حکومت اِن مظاہروں کے نتیجے میں پسپائی اختیار کرے اور منکرات کے خاتمے اور حدود اللہ کے نفاذ کا آغاز کر دے۔ اِس طرح انقلابی جماعت ایک ایک منکر کو ختم کروا کر حدود اللہ کا نفاذ کرواتی رہے گی اور پورا نظام درست ہونے تک یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

2. حکومت انقلابی تحریک کو اپنے خلاف انا کا مسئلہ بنا لے اور اپنی بقاء اور مفادات کے تحفظ کے لیے تحریک کو مکمل طور پر کچلنے کا فیصلہ کرے۔ اِس صورت میں حکومت پر قابض مفاد یافتہ طبقات، ریاست کی پولیس اور فوج کو اِس تحریک کو کچلنے کے لیے بے دریغ استعمال کریں گے۔ لاٹھیاں برسائی جائیں گی، آنسو گیس کے شیل پھینکے جائیں گے، گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی اور گرفتاریاں ہوں گی۔ اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی اور کتنوں کو شہید کرے گی۔ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی دینی بھائی اور ہم وطن ہیں۔ یہ کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اُس کے نفاذ کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائے گا اور اِن شاء اللہ انقلابی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو گی۔ ماضی قریب میں اِس کی ایک مثال موجود ہے۔ 1977ء میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کے دوران پاکستان فوج نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے

انکار کر دیا تھا۔ لیکن اُس وقت چونکہ کوئی ایک منظم جماعت اقتدار سنبھالنے کے لیے موجود نہ تھی، لہٰذا فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

3. اگر حکومتِ وقت اِس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے، تو جن لوگوں نے اِس راستے میں جانیں دی ہوں گی، اُن کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی۔ اِن شاء اللہ وہ اجرِ عظیم اور فوزِ کبیر سے نوازے جائیں گے۔ ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلّف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں، البتہ اُس کو بدلنے کی جدوجہد بحسب قدرت و شعور ہم پر فرض ہے۔ مزید برآں! اِن شاء اللہ اِنہی جانثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے جلد یا بدیر کوئی نئی اسلامی انقلابی تحریک اُبھرے گی جو طاغوتی، استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی۔ اِس طرح وہ وقت آکر رہے گا جس کی خبر الصادق والمصدوق ﷺ نے دی ہے کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین اِسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا:

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

((وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ))

"اور تاکہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون غیب میں رہتے ہوئے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے"

- آیت کے اِس حصے میں لِيَعْلَمَ کا لفظی ترجمہ ہو گا اللہ جان لے۔ لیکن اللہ کا علم چونکہ قدیم ہے لہٰذا مناسب ترجمہ ہو گا کہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مدد کرتا ہے غیب میں رہتے ہوئے۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مدد سے مراد اللہ کے دین کی مدد ہے۔ دین اللہ کا ہے اور اُسے غالب کرنا، مشن تھا اللہ کے رسول ﷺ کا۔ لہٰذا جو دین کے غلبے کی جدوجہد کر رہا ہے وہ درحقیقت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مدد کر رہا ہے۔ یہ بات سورۃ الصف[61] کی آخری آیت میں اِس طرح بیان کی گئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ہو جاؤ اللہ کے مددگار جیسا کہ پکارا تھا حضرت مریم علیہا السلام کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کے لیے۔ ساتھیوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔

- نصرتِ رسول ﷺ کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا ایک بڑا پیارا اور خاص طور پر ہمارے لیے انتہائی امید افزا ارشاد ہے:

يَا لَيْتَنِيْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ! قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَسْنَا اِخْوَانَكَ وَ اَصْحَابَكَ؟ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنَّ قَوْمًا يَجِيْئُوْنَ مِنْ بَعْدِكُمْ، يُؤْمِنُوْنَ بِيْ اِيْمَانَكُمْ، وَيُصَدِّقُوْنِيْ تَصْدِيْقَكُمْ، وَيَنْصُرُوْنِيْ نَصْرَكُمْ، فَيَا لَيْتَنِيْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ[1]

"اے کاش میں ملتا اپنے بھائیوں سے! صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم آپ کے بھائی اور ساتھی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں! لیکن یہ وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں گے، مجھ پر ایسے ایمان لائیں گے جیسے تم ایمان لائے ہو اور میری اُسی طرح تصدیق کریں گے جیسے تم نے کی ہے اور اُسی طرح میری مدد کریں گے جیسے تم نے کی ہے، تو اے کاش میں ملتا اپنے بھائیوں سے"۔

- آیت کے اِس حصے میں اہلِ ایمان کو بہت بڑا اعزاز دیا جا رہا ہے کہ اگر وہ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جہاد کریں گے تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے مددگار قرار پائیں گے۔ کہاں اللہ اور کہاں انسان۔ پھر کیا مقام و مرتبہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا اور کیا اوقات ہے ایک عام انسان کی۔ اللہ جو چاہے سو کر سکتا ہے لیکن ہمارے امتحان کے لیے اُس نے دین کی سربلندی کے لیے کوشش کا ہمیں حکم دیا ہے۔ وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کون ہے جو اُس کے نازل کردہ نظامِ عدل و قسط کو نافذ کرنے کے لیے اور اُس کی نازل کردہ میزان کو نصب کرنے کے لیے

---

(1) المطالب العالية للحافظ ابن حجر العسقلاني، كتاب المناقب، باب فضل الصحابة والتابعين على الإجمال، عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ

اپنا مال نذر کرتا ہے اور اپنی جان کی بازی لگاتا ہے۔ اب جو کوئی ایسا کرے گا، وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا مددگار قرار پائے گا۔ سچے اہل ایمان نہ صرف خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر کاربند ہوتے ہیں بلکہ عالم واقعہ میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (الحجرات 49:15)

"مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک میں نہ پڑے اور اُنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی لوگ سچے ہیں"۔

مال و جان سے جہاد کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کی قدر افزائی کی جاتی ہے اور اللہ اُنہیں اپنا اور اپنے رسول ﷺ کا مددگار قرار دیتا ہے۔ بندے کے لیے اِس سے بڑھ کر اور کوئی اونچا مقام نہیں ہو سکتا۔ خوش نصیب ہیں وہ بندے جو اللہ کے وفادار ہیں، اللہ اور اُس کے رسول سے سچی محبت کرنے والے ہیں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے تن من دھن سے جہاد کرتے ہوئے اپنے لیے سعادتیں سمیٹ رہے ہیں۔ یہ سعادتیں بدرجۂ اتم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حصے میں آئیں کہ اُنہوں نے پہلے اندرونِ ملکِ عرب غلبۂ دین کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی نصرت کی اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کے ایک بڑے حصے تک اِس عادلانہ نظام کی توسیع کا کارنامہ انجام دیا۔ اِس حوالے سے حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ تاریخی ہیں جو اُنہوں نے ایران پر حملے کا مقصد بیان کرتے ہوئے اِرشاد فرمائے تھے کہ:

اَللّٰهُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللهِ، وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سَعَتِهَا، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ (1)

"ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے بھیجا ہے کہ ہم لوگوں کو بندوں کی غلامی سے اللہ کی غلامی کی طرف لائیں، اور دنیا کی تنگی سے اُس کی وسعت کی طرف، اور ادیانِ باطلہ کے ظلم سے

(1) البداية والنهاية، سَنَةُ أَرْبَعَ عَشْرَةَ مِنَ الْهِجْرَةِ النبوية

اسلام کے عدل کی طرف لائیں"۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے دین کی خدمت کی توفیق نصیب فرمائے:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا اَنْ نُّجَاھِدَ فِیْ سَبِیْلِكَ بِاَمْوَالِنَا وَاَنْفُسِنَا - آمین

((اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ))

"بے شک اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے"۔

- آیت کے اِس آخری حصے کے ذریعے اِس مغالطے کی نفی کی گئی کہ اللہ عاجز و لاچار ہے اور بندوں سے مدد مانگ رہا ہے۔ دین کی سربلندی کی خاطر کوشش کرنے کا تقاضا، اللہ کی طرف سے صرف اِس لیے ہے تاکہ ہم اِس کے ذریعے اپنے ایمان کی سچائی کا ثبوت فراہم کر دیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ بہت قوت والا اور زبردست ہے۔ اُس کی حکومت اپنے بل پر قائم ہے اور اُس کا اختیار پوری کائنات پر محیط ہے۔ اُسے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک حکم سے ظالموں کو نیست و نابود اور دینِ حق کو غلبہ عطا کر سکتا ہے۔ یہ اُس کی اپنے بندوں کے لیے قدر افزائی ہے کہ اگر وہ دین کے لیے مال صرف کریں تو وہ اِس کو اپنے ذمے قرض سے تعبیر کرتا ہے اور اگر وہ اُس کے دین کے لیے اپنی جانیں کھپائیں تو وہ اِسے اپنی نصرت قرار دیتا ہے۔

سورۃ الحدید حصّہ ہفتم: آیات 26 تا 29

رہبانیت-دین کے تقاضوں سے فرار کی راہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ
كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ
اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ
ِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ
اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ
اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

تمہیدی نکات:

- سورۂ حدید کے تیسرے حصے میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ دینی تقاضوں سے پہلو تہی کی ایک بڑی وجہ ہے دنیا پرستی۔ اب سورۂ حدید کے اِس ساتویں اور آخری حصے میں دینی تقاضوں سے فرار کی ایک اور وجہ رہبانیت یعنی ترکِ دنیا بیان کی جا رہی ہے۔ یہ وہ گمراہی ہے جو دنیا پرستی کی ضد ہے۔ ایک انتہا یہ ہے کہ انسان دنیا ہی کا ہو کر رہ جائے۔ لذاتِ دنیوی اور دنیا کی آسائش و آرام ہی اُس کا مقصود و مطلوب بن جائے۔ اُس کی بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا مقصد زیادہ سے زیادہ دنیا کمانا، کاروبار کو جمانا، مال اور اثاثہ جات کو ترقی دینا اور دنیا میں کسی منصب،

حیثیت، اقتدار اور وجاہت کو حاصل کرنا ہو۔ یہ دنیا پرستی انسان کو غافل کر دیتی ہے دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ (الکہف 18: 103-104)

"کیا ہم تمہیں بتائیں وہ لوگ جو سب سے زیادہ خسارے میں ہیں اپنی محنت کے اعتبار سے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی محنتیں برباد ہو گئیں دنیا کی زندگی کے لیے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے خوب کمائی کی ہے"۔

- دوسری انتہا رہبانیت یعنی ترکِ دنیا ہے۔ یہ نفس کشی ہے یعنی نفس کے جذبات اور اُس کی جائز خواہشات و شہوات کو بھی کچل دینا۔ شادی بیاہ، کاروباری معاملات اور لذاتِ دنیا کو اللہ سے تعلق کی راہ میں رکاوٹ سمجھنا اور اِن سے بچنے کے لیے آبادیوں سے دور جنگلوں میں جا بسنا۔ وہاں راہب خانوں یا غاروں میں نفس کشی کے لیے ریاضتیں کرنا۔ یہ طرزِ عمل بھی دینی ذمہ داریوں سے گریز کی ایک صورت ہے جس میں انسان دنیا کے نظام کو شیطانی قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی ذات ہی کے تزکیے میں لگ جاتا ہے۔ باطل قوتوں کو اپنی عیاشیوں اور ظلم و ستم کے لیے کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور وہ پوری آزادی سے نوعِ انسانی کا استحصال کر کے اُن کی دنیا بھی برباد کرتی ہیں اور اُنہیں آخرت کی تیاری سے بھی محروم کر دیتی ہیں۔

- رہبانیت کی گمراہی کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے والوں نے کیا۔ یہ دراصل ردِّ عمل تھا یہود کی دنیا پرستی کا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بدترین دشمن تھے۔ یہود دنیا پرستی کی اُس انتہا پر پہنچے کہ اُن کے علماء نے فتویٰ فروشی اور کتمانِ حق کے ذریعے دین کو بھی دنیا کی کمائی کا ذریعہ بنا لیا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور اُنہوں نے علمائے یہود کے جرائم کو بے نقاب کیا تو اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مرتد ہونے کا بہتان لگا کر اُنہیں مصلوب کرنے کی کوشش کی۔ یہود کی دشمنی کے ردِّ عمل میں عیسائی دنیاداری سے اِس قدر بیزار ہوئے کہ وہ ترکِ دنیا کی گمراہی تک جا پہنچے۔ سورۂ فاتحہ میں صراطِ مستقیم کے ذکر کے بعد، مسندِ احمد کی ایک روایت کے مطابق، یہود کو مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ قرار دیا گیا کیونکہ اُنہوں نے صراطِ مستقیم سے ہٹ کر بے

اعتدالی کی ایک راہ اختیار کی اور عیسائیوں کو اَلضَّآلِّیْن کہا گیا(۱) کیونکہ وہ بے اعتدالی کی دوسری انتہا پر پہنچ گئے۔

- سورۂ حدید کے اِس حصے میں دینی تقاضوں سے گریز کے حوالے سے عیسائیوں کی ایک گمراہی یعنی رہبانیت کی نفی کی گئی ہے۔ اُن قوموں میں سے جو اپنی نسبت رسولوں علیہم السلام کی طرف کرتی ہیں، عیسائی وہ پہلی قوم تھے جنہوں نے رہبانیت کی ابتدا کی۔ اِس مقام پر عیسائیوں کے ذکر سے قبل، سب سے پہلے رسول اور آدمِ ثانی حضرت نوح علیہ السلام اور ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا۔

آیت 26:

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ ... اور ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کو ... وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ ... اور جاری کیا اُن دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتابوں کا سلسلہ ... فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ ... تو کچھ اُن میں سے ہدایت پر رہے ... وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۶ اور اکثر اُن میں سے نافرمان نکلے۔

- اِس آیت میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام پہلے نبی ہیں جن کو رسول بنایا گیا۔ اُن کی رسالت کا دور تقریباً چار ہزار قبلِ مسیح کا ہے۔ اُن کی قوم کردستان کے علاقے میں آباد تھی۔ اُنہوں نے 950 برس تک اپنی قوم کو تبلیغ کی۔ اُن کی قوم بت پرستی کے شرک میں مبتلا تھی۔ قوم کے پانچ مشہور بتوں کے نام ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر تھے۔ اُنہوں نے قوم کو توحید کی دعوت دی اور صاف فرمایا کہ میرے پیشِ نظر تمہاری خیر خواہی ہے۔ میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہیں ہوں۔ اُن کی دعوت پر صرف چند ایسے لوگ ایمان لائے جو معاشرے کے غریب اور نادار طبقات میں سے تھے۔ قوم کی اکثریت نے اُن کی دعوت کو رد کر دیا۔ جب قوم، حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف سرکشی کی آخری انتہا تک پہنچ گئی تو اُنہوں نے قوم کے خلاف اللہ سے بد دعا کی کہ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (القمر 54: 10) "بے شک میں

(۱) مسند احمد، کتاب مُسْنَدِ الْبَصْرِیِّیْنَ، باب حَدِیْثُ رَجُلٍ سَمِعَ النَّبِیَّ ﷺ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَقِیْقٍ رضی اللہ عنہ

مغلوب ہوا چاہتا ہوں (اے اللہ) بدلہ لے"۔ اللہ نے فریاد سنی حضرت نوح علیہ السلام کی اور اُنہیں ایک کشتی بنانے کا حکم دیا۔ اِس کے بعد زمین میں ایک تنور سے پانی ابلنا شروع ہوا اور آسمان سے بارش برستی رہی۔ اللہ کے حکم پر حضرت نوح علیہ السلام اور تمام اہلِ ایمان کشتی میں سوار ہو گئے۔ دیگر مخلوقات کا ایک ایک جوڑا بھی کشتی میں سوار کر لیا گیا۔ زمین سے ابلنے اور آسمان سے برسنے والے پانی کی اِس قدر کثرت ہوئی کہ زبردست طوفان آگیا۔ اِس طوفان سے پوری کافر قوم ہلاک ہو گئی۔ حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والے اِس عذاب سے محفوظ رہے۔

- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ 1861 قبل مسیح کا ہے۔ آپ عراق کے شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک ایسے ماحول میں جنم لیا جہاں ایک طرف ستارہ پرستی، سورج پرستی، چاند پرستی اور بت پرستی کی صورت میں مذہبی شرک اپنے عروج پر تھا اور دوسری طرف نمرود خدائی کا دعویدار تھا اور قوم اُسے خدا تسلیم کر کے سیاسی شرک کا بھی ارتکاب کر رہی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شرک کی اِن دونوں قسموں کی بڑے زوردار انداز میں مخالفت کی اور قوم کو اِن سے باز رہنے کی تلقین کی۔ قوم نے اُن کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور اِس کے برعکس وہ اُن کی جان کی دشمن ہو گئی۔ پھر اُنہیں آگ کے ایک جوش مارتے ہوئے الاؤ میں ڈال دیا گیا لیکن اللہ نے ایک معجزے کے ذریعے اُن کی حفاظت فرمائی۔ جو قوم نبی کی جان کی دشمن ہو جائے، اُس سے کسی خیر کی توقع نہیں ہوتی، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے علاقے سے ایمان لانے والے چند ساتھیوں سمیت ہجرت کی۔ اِس کے بعد اُنہوں نے جزیرہ نما عرب کے مختلف علاقوں میں دعوتِ توحید کو عام کرنے کا مشن جاری رکھا اور کئی مقامات پر اِس دعوت کے مراکز قائم کیے۔ اللہ نے آپ کو تین بیٹے عطا کیے۔ پہلے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جن کو آپ نے مکہ میں آباد کیا، دوسرے حضرت اسحاق علیہ السلام جن کو آپ نے فلسطین میں بسایا اور تیسرے حضرت مدیان جن کو مکہ اور فلسطین کے درمیان کے علاقے میں سکونت دی۔

- حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اُن دونوں ہی کی نسل میں رکھ دی نبوت اور کتاب۔ حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ اُن کے بعد نسلِ انسانی اُن ہی کی اولاد سے جاری رہی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (الصّٰفّٰت 37:77)

"اور ہم نے اُن کی اولاد کو ہی کر دیا باقی رہنے والا"۔

حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے حضرت سام، حضرت حام اور حضرت یافث ایمان لے آئے اور بعد میں اِن ہی سے نسلِ انسانی جاری ہوئی اور ظاہر ہے کہ سلسلۂ نبوت بھی پھر حضرت نوح علیہ السلام ہی کی نسل میں باقی رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت سام کی نسل میں سے تھے۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اپنی عنایات کی بارش فرمادی:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَ اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ (النحل 16:120-122)

"بیشک ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں اللہ کی ایک فرمانبردار امت تھے اور بالکل یکسو تھے (اللہ کی بندگی کے لیے) اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ اُس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ نے اُن کو چن لیا تھا اور سیدھی راہ پر چلایا تھا۔ اور ہم نے اُن کو دنیا میں بھی بھلائی دی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہوں گے"۔

اللہ نے اپنے ساتھ اُنہیں یہ نسبت دی کہ اپنا خلیل بنالیا (النساء 4:125)، لوگوں کے ساتھ یہ اعزاز بخشا کہ اُن کو امام کے مرتبے پر فائز فرمایا (البقرۃ 2:124) اور انبیا کے ساتھ اِس تعلق سے نوازا کہ ابو الانبیاء کی شان عطا کی یعنی اُن کے بعد تمام انبیا اُن ہی کی ذریت میں سے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جبکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل میں کئی انبیاء علیہم السلام آئے۔ اِن میں سب سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے اور آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت مدیان کی نسل میں سے تھے۔

- آیت کے آخر میں فرمایا فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ "تو کچھ اُن میں سے ہدایت پر رہے اور اکثر اُن میں سے نافرمان نکلے"۔ حضرت نوح علیہ السلام کے چار بیٹوں میں سے جہاں تین ایمان لائے وہیں ایک بیٹا کنعان ایمان لانے سے محروم رہا۔ اللہ نے جب قوم پر عذاب نازل کیا تو اُس کو بھی طوفان میں غرق کر دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اللہ سے اُس کے حق میں شفاعت کرنا چاہی تو اللہ نے جواب دیا:

يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ھود 11:46)

"اے نوح علیہ السلام! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں، اُس کا عمل ٹھیک نہیں تھا"۔

گویا اللہ کے نزدیک اہمیت نسلی تعلق کی نہیں بلکہ انسان کی سیرت و کردار کی ہے۔ اِسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے وہ بھی تھے جنہوں نے راہِ ہدایت کو اختیار کی، اُس پر گامزن ہوئے اور اُسی پر کاربند رہے۔ البتہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہوئی کہ جنہوں نے راہِ ہدایت کو چھوڑ دیا، اللہ کی طے کردہ حدود سے تجاوز کیا اور گمراہی میں بہت دور نکل گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے حوالے سے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا:

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (ابراھیم 14:36)

"سو اُن میں سے جس نے میری پیروی کی، اُس کی مجھ سے نسبت ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو (اے اللہ) تو بخشنے والا مہربان ہے"۔

اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو

یہ آیت تھی تمہیدی نوعیت کی۔ اب اگلی آیت سے اصل مضمون کا آغاز ہوتا ہے۔

آیت 27:

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا ... پھر ہم نے اُن ہی کے نقشِ قدم پر بھیجا اپنے رسولوں کو ... وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ... اور اُن کے پیچھے بھیجا عیسیٰ علیہ السلام یعنی مریم کے بیٹے کو ... وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ ... اور دی اُن کو انجیل ... وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ۙ ... اور

رکھی اُن کے دلوں میں جنہوں نے اُن کی پیروی کی نرمی اور مہربانی... وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا... اور رہبانیت (کی بدعت) اُنہوں نے (خود) شروع کی... مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ ... ہم نے اُن کو اِس کا حکم نہیں دیا تھا مگر اللہ کی رضا کے حصول کے لیے... فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ... پھر اُنہوں نے اُس کو نہیں نبھایا جیسا کہ اُس کو نبھانے کا حق تھا... فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ... پس ہم نے دیا اُن کو جو اُن میں سے ایمان لائے اُن کا اجر... وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

- اِس آیت میں فرمایا گیا کہ اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد پے بہ پے کئی رسول علیہم السلام بھیجے۔ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ سے مراد یہ ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت اور مقصد ایک ہی تھا۔ سورۃ النساء[4] آیت 165 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا

"(سب) رسولوں علیہم السلام کو (اللہ نے) خوشخبری سنانے والے اور خبردار کرنے والے (بنا کر بھیجا تھا) تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی حجت نہ رہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے"۔

- اِس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ذریت میں سے آخری رسول ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے انجیل عطا فرمائی اور اُن کے پیروکاروں یعنی عیسائیوں کو اللہ نے ایک خاص باطنی وصف عطا فرمایا یعنی دلوں میں نرمی اور گداز۔

- دل میں نرمی اور گداز کی کیفیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:

مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ[1]

"جو کوئی دل کی نرمی سے محروم ہو گیا وہ خیر سے محروم ہو گیا"۔

یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ عیسائیوں کے دلوں میں نرمی کی کیفیت دراصل ردِّ عمل تھا اُن یہودیوں کے طرزِ عمل کا جن کے دلوں کی سختی اپنی آخری حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک طرف وہ دنیاداری میں بری طرح ملوث ہو کر احکاماتِ شریعت کو پامال کرنے میں جری تھے اور دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دشمنی میں انتہائی پستی پر اتر آئے تھے۔ یہودیوں کے دلوں کی سختی کا ذکر اِسی سورت کی آیت 16 میں اِس طرح آیا:

وَ لَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ

"اور لوگ نہ ہو جائیں اُن کی طرح جن کو کتابیں دی گئی تھیں اِس سے پہلے، پھر اُن پر زمانہ طویل گزر گیا (غفلت میں) تو سخت ہو گئے اُن کے دل اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں"۔

سورۃ البقرۃ[2] آیت 74 میں یہ مضمون زیادہ وضاحت سے آیا ہے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

"پھر اِس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور اُن میں سے پانی بہنے لگتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے"۔

- عیسائیوں کی رقتِ قلبی کے ذکر کے بعد اب وہ مضمون آ رہا ہے جس کے لیے ایک طویل تمہید باندھی گئی۔ یہود کی قساوتِ قلبی اُنہیں دنیا داری کی انتہا پر لے گئی اور عیسائیوں کی رقتِ قلبی، ترکِ دنیا کی گمراہی تک جا پہنچی۔ عیسائیوں نے کاروباری معاملات اور شادی بیاہ کے تعلق

(۱) صحیح مسلم، کتاب البِرِّ وَالصِّلَةِ وَالآدَابِ، باب فَضْلِ الرِّفْقِ عن جریر رضی اللہ عنہ

کو اللہ کے ساتھ لو لگانے اور آخرت کی تیاری کی راہ میں رکاوٹ سمجھا۔ اُنہوں نے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے رَہبانیت کی بدعت ایجاد کرلی۔ طے کیا کہ ہم آبادیوں سے دور غاروں اور راہب خانوں میں رہ کر اللہ اللہ کریں گے، سبزیوں پر گزارا کریں گے، نہ شادی کریں گے، نہ کاروبار کریں گے اور نہ مرغن غذائیں استعمال کریں گے۔

- اُنہوں نے یہ سب نیک نیتی سے کیا تھا۔ مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ کے دو مفہوم ممکن ہیں۔ پہلا یہ کہ ہم نے اُن کو رہبانیت کا حکم نہیں دیا تھا مگر اِس بات کا کہ اللہ کی رضا حاصل کریں۔ یعنی اللہ کی رضا جوئی کو اپنا مقصود و مطلوب اور نصب العین بنالیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اُن پر رہبانیت اختیار کرنا لازم نہ کیا تھا مگر اُنہوں نے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ایک غیر فطری طریقہ خود سے ایجاد کرلیا۔ بہر حال عیسائیوں کا رہبانیت اختیار کرنا کسی فسادِ نیت کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ جو کچھ کیا تھا اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیا تھا لیکن اُن کا نیکی کا جذبہ حد اعتدال سے تجاوز کر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اُن کی رہبانیت کا تذکرہ مذمت کے اسلوب میں نہیں کیا۔

- آیت کے اگلے حصے میں فرمایا فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا "پھر اُنہوں نے اُس کو نہیں نبھایا جیسا کہ اُس کو نبھانے کا حق تھا"۔ رہبانیت کے نام پر اپنے لیے چند پابندیاں اختیار کرلیں لیکن پھر اُن کو نبھا نہ سکے۔ انسان کے فطری تقاضے اور داعیاتِ نفس بڑے منہ زور ہیں۔ اُن کو کچلنے کی کوشش میں انسان لازماً شکست سے دوچار ہوتا ہے۔ رہبانیت کے پردے میں وہ کچھ ہوا کہ اِس کی تاریخ بدترین دنیاداری اور ہوس پرستی کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بظاہر زہد کا لبادہ اوڑھے رکھا لیکن درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان واسطہ اور وسیلہ بن کر، نذرانوں اور صدقات کی وصولی کے ذریعے عوام الناس کا خون نچوڑا گیا۔ اِسی لیے اقبال نے کہا:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

راہب خانوں میں راہب اور راہبائیں تجرد کی زندگی بسر کرتے ہوئے اللہ اللہ کرتے ہوئے دکھائی دیے لیکن اندرونی طور پر شہوت رانی اور درندگی اِس انتہا کو پہنچی کہ راہب خانوں کے

تہہ خانوں سے ناجائز بچوں کے قبرستان بر آمد ہوئے۔ گویا زہد کے پردے میں بدکاریاں بھی جاری رہیں اور ناجائز اولاد کے گلے بھی گھونٹے جاتے رہے۔

- آیت کے آخری حصے میں فرمایا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ "پس ہم نے دیا اُن کو جو اُن میں سے ایمان لائے اُن کا اجر اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں"۔ ایمان لانے والوں سے مراد وہ نیک اور راست باز عیسائی ہیں جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ اِن میں سب سے زیادہ نمایاں حبشہ کے بادشاہ شاہ نجاشی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اِس کے علاوہ اور بھی عیسائی، وفود کی صورت میں مکہ آکر حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے رہے۔ اِن کے ایمان لانے اور اجر و ثواب کا تذکرہ اللہ نے اِس طرح کیا:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ (المائدۃ 5: 82-85)

"تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں کے قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اِس لیے کہ اُن میں عالم بھی ہیں اور اللہ سے ڈرنے والے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ اور جب اُنھوں نے سنا اُس کلام کو جو رسول ﷺ پر نازل کیا گیا تو تم دیکھتے ہو کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اِس لیے کہ اُنھوں نے حق بات پہچان لی اور وہ (اللہ کی جناب میں) عرض کرنے لگے کہ اے رب! ہم ایمان لے آئے، پس ہمیں شامل فرما لے (حق کی) گواہی دینے والوں میں اور ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اُس حق پر جو ہمارے پاس آ چکا ہے اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک بندوں

کے ساتھ (جنت میں) داخل کرے گا۔ تو اللہ نے ان کو اِس کہنے کے عوض (جنت کے) باغ عطا فرمائے جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور نیکوکاروں کا یہی صلہ ہے"۔

البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ عیسائیوں میں ایمان لانے والوں کی تعداد قلیل تھی اور اُن کی اکثریت فسق وفجور کے اندر مبتلا ہو چکی تھی۔ سینٹ پال نے تثلیث، کفارہ اور شریعت کے ساقط ہونے کے گمراہ نظریات کے ذریعے عیسائیت کو پال ازم بنا دیا اور بے عملی کی انتہا پر پہنچا دیا۔

- اِس آیت میں رہبانیت کا آغاز کرنے کے حوالے سے اِبْتَدَعُوْا کا لفظ آیا ہے۔ اِس لفظ کے مادّہ ب دع سے ایک اہم اصطلاح بنتی ہے "بدعت"۔ گویا رہبانیت ایک بدعت تھی جو عیسائیوں نے ایجاد کی۔ جس طرح شرک، توحید کی ضد ہے، بالکل اِسی طرح بدعت سنت کی ضد ہے۔ بدعت کا آغاز کرنے والے سنت پر عمل سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اِرشادِ نبوی ﷺ ہے:

مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِّنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ(۱)

"نہیں ایجاد کرتی کوئی قوم کسی بدعت کو لیکن اُٹھالی جاتی ہے اُسی مانند کوئی سنت، لہٰذا سنت کو مضبوطی سے تھامنا بہتر ہے بدعت ایجاد کرنے سے"۔

سلف صالحین کے نزدیک بدعت ایک ایسا نو ایجاد طریقۂ عبادت ہے جس کا آغاز ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے بعد کیا گیا ہو لیکن وہ دورِ نبوی ﷺ یا دورِ خلافتِ راشدہ میں داعیہ اور سبب موجود ہونے کے باوجود نہ قولاً ثابت ہو نہ فعلاً نہ صراحۃً اور نہ ہی اشارۃً۔ گویا بدعت کا آغاز یہ ثابت کرنا ہے کہ دین، عہدِ رسالت ﷺ میں مکمل نہیں ہوا تھا یا پھر رسول اللہ ﷺ پر خیانت کی تہمت لگانا ہے کہ ثواب کے بعض کاموں سے آپ ﷺ نے امت کو بے خبر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ میں بدعت کی شدید مذمت آئی ہے:

مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ(۲)

---

(۱) مسند احمد، کتاب مُسْنَدُ الشَّامِيِّينَ، باب غُضَيْفِ بْنِ الْحَارِثِ، عَنْ غُضَيْفِ بْنِ الْحَارِثِ رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح البخاری، کتاب الصُّلْحِ، باب إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ و صحیح مسلم، کتاب الْأَقْضِيَةِ، باب نَقْضِ الْأَحْكَامِ الْبَاطِلَةِ وَرَدِّ مُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، عَنْ عائشة رضی اللہ عنہا

"جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز داخل کرے جو دین میں داخل نہیں وہ مردود ہے"۔

إِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ وَأَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ (۱)

"بلاشبہ سب سے سچا کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طرزِ عمل ہے اور بدترین کام وہ ہے جو نیا ایجاد کیا جائے اور ہر نیا ایجاد کیا گیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے"۔

وَعَظَنَا رَسُولُ اللهِ مَوْعِظَةً وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ كَأَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا، قَالَ: أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ، وَأَنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرَى اخْتِلَافاً كَثِيراً، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (۲)

"صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ ہمیں نصیحت فرمائی اللہ کے رسول ﷺ نے، ایسی نصیحت کہ جس کو سن کر (ہمارے) دل دہل گئے (ہماری) آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ نصیحت تو گویا رخصت ہونے والے کی وصیت لگتی ہے تو آپ ہمیں وصیت فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی اور اپنے حاکموں کے احکام سننے اور قبول کرنے کی، خواہ وہ حاکم ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ میرے بعد جو زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کو اپنے اوپر لازم کرلو اور اُس کو دانتوں سے مضبوط تھام لو، اور نئی نئی باتوں سے بچتے رہو، کیوں کہ ہر نئی جاری کی ہوئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔

---

(۱) سنن النسائی، کتاب صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ، باب كَيْفَ الْخُطْبَةُ، عَنْ جابرٍ رضی اللہ عنہ

(۲) سنن الترمذی، کتاب العلم، باب مَا جَاءَ فِي الْأَخْذِ بِالسُّنَّةِ وَاجْتِنَابِ الْبِدَعِ و سنن ابی داؤد، کتاب السُّنَّةِ، باب فِي لُزُومِ السُّنَّةِ، عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رضی اللہ عنہ

أَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ فَمَنْ وَرَدَهُ شَرِبَ مِنْهُ وَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهُ أَبَدًا، لَيَرِدُ عَلَيَّ أَقْوَامٌ أَعْرِفُهُمْ وَيَعْرِفُونِي ثُمَّ يُحَالُ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَأَقُولُ إِنَّهُمْ مِنِّي فَيُقَالُ إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا بَدَّلُوا بَعْدَكَ فَأَقُولُ سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ بَدَّلَ بَعْدِي[1]

"میں تم سب سے پہلے اُس حوض (یعنی کوثر) پر پہنچ جاؤں گا۔ تو جو کوئی اُس پر پہنچا اور اُس نے اُس میں سے پی لیا تو اُسے کبھی بھی پیاس نہ لگے گی۔ (اُس حوض پر) میرے پاس کچھ لوگ آئیں گے۔ میں اُنہیں پہچان لوں گا اور وہ لوگ مجھے پہچان لیں گے۔ پھر میرے اور اُن کے درمیان ایک آڑ حائل کر دی جائے گی تو میں کہوں گا کہ یہ تو میرے اُمتی ہیں، اِس پر مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ اُنہوں نے آپ کے بعد (دین کو) بدل ڈالا تھا۔ پھر میں کہوں گا دوری ہو دوری ہو اُس سے جو بدل دے (دین کو) میرے بعد"۔

مسندِ احمد میں روایت ہے کہ:

إِنَّ الشَّيْطَانَ قَالَ وَعِزَّتِكَ يَا رَبِّ لَا أَبْرَحُ أُغْوِي عِبَادَكَ مَا دَامَتْ أَرْوَاحُهُمْ فِي أَجْسَادِهِمْ قَالَ الرَّبُّ وَعِزَّتِي وَجَلَالِي لَا أَزَالُ أَغْفِرُ لَهُمْ مَا اسْتَغْفَرُونِي[2]

"بلاشبہ شیطان نے کہا قسم ہے تیری عزت کی اے رب! میں برابر تیرے بندوں کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک اُن کی روحیں اُن کے جسم میں ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا قسم ہے میری عزت کی اور بلند مرتبت کی کہ میں برابر اُنہیں معاف کرتا رہوں گا جب تک وہ مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے"۔

شیطان نے پھر یہ تدبیر کی کہ انسانوں کو بدعات میں لگا دو جنہیں وہ گناہ نہیں بلکہ ثواب کا کام سمجھیں تاکہ ایسے کاموں پر اللہ سے بخشش مانگنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

- دینِ اسلام میں رہبانیت کی بدعت کی بڑی سختی کے ساتھ نفی کی گئی ہے تاکہ اُمتِ مسلمہ کو اِس گمراہی سے محفوظ رکھا جا سکے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ[3]

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب مَا جَاءَ فِي قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾، عَنْ سهل بن سعد رضی اللہ عنہ

(۲) مسند أحمد، كتاب مُسْنَدِ الْمُكْثِرِينَ، باب مُسْنَدُ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ

(۳) "لَا زِمَامَ وَلَا حِزَامَ وَلَا رَهْبَانِيَّةَ وَلَا تبتل وَلَا سياحة فِي الْإِسْلَامِ"
غريب الحديث لابن قتيبة، جزء ۱، باب أَلْفَاظ من أَحَادِيث المولد والمبعث، عَنْ طَاوُوس رضی اللہ عنہ

"اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں"۔ بلاشبہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ دین ایک ایسی راہ کی تعلیم دیتا ہے جس میں ضبطِ نفس (self control) ہے، نفس کشی (self annihilation) نہیں ہے۔ تمام فطری و جبلی تقاضوں کی چند حدود و قیود کے ساتھ تسکین کا بھرپور سامان ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف 7:32)

"(اے نبی ﷺ) پوچھیے کس نے حرام کیا اُس زیب و زینت کو اور اُس پاکیزہ رزق کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا فرمایا ہے؟"

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا إِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَّا تَكُوْنَ بِمَا فِي يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِي يَدِ اللّٰهِ (۱)

"دنیا میں زہد کے معنی یہ نہیں کہ آدمی حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لے اور نہ یہ کہ مال کو ضائع کرے، لیکن زہد کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں زیادہ اعتماد اُس شے پر ہو جو اللہ کے ہاتھ میں ہے بہ نسبت اُس کے جو تیرے ہاتھوں میں ہے"۔

آپ ﷺ نے اپنے بعض ساتھیوں کو ترکِ دنیا کی طرف مائل پایا تو بڑی سختی سے منع فرمایا:

لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّدَ عَلَيْكُمْ، فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ، فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ (۲)

"اپنے اوپر زیادہ سختی نہ کرو ورنہ تم پر سختی کی جائے گی، بے شک ایک قوم (یعنی عیسائیوں) نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے اُن پر سختی کی پس راہب خانوں اور گرجوں میں اُن کے بقایا بیٹھے ہیں"۔

بخاری و مسلم میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ:

جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى بُيُوتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا أُخْبِرُوْا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَهُ مَا

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد، باب مَا جَاءَ فِي الزَّهَادَةِ فِي الدُّنْيَا، عَنْ ابی ذر رضی اللہ عنہ

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد، عَنْ انس بن مالك رضی اللہ عنہ

تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَأَخَّرَ قَالَ أَحَدُهُمْ أَمَّا أَنَا فَإِنِّيْ أُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا أُفْطِرُ وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا فَجَاءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِلَيْهِمْ فَقَالَ أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا أَمَا وَاللهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهٗ لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ(۱)

"رسول اللہ ﷺ کے گھر میں تین آدمی آپ کی عبادت کا حال و کیفیت پوچھنے آئے۔ جب اُنہیں آپ ﷺ کی عبادت کی کیفیت بتائی گئی تو گویا اُنہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کو کم سمجھا۔ پھر اُن لوگوں نے کہا ہم کہاں اور نبی ﷺ کہاں یعنی ہمیں آپ ﷺ سے کیا نسبت۔ اللہ تعالیٰ نے تو اُن کے اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ پھر اُن میں سے ایک شخص نے کہا میں تو اب تمام رات نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور کبھی افطار نہیں کروں گا۔ ایک اور نے کہا میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ اتنے میں اُن کے پاس نبی ﷺ تشریف لائے اور فرمایا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ یہ کہا ہے۔ سنو اللہ کی قسم! میں تمہاری نسبت اللہ سے زیادہ ڈرتا ہوں اور اُس کی نافرمانی سے بچنے کا زیادہ خیال رکھتا ہوں، مگر (دیکھو) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور (کسی دن) نہیں بھی رکھتا ہوں اور (رات میں) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے منہ موڑے گا اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو عبادات سے بہت شغف تھا۔ نبی اکرم ﷺ کو عبادات کے حوالے سے اُن کے معمولات کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا:

يَا عَبْدَ اللهِ أَلَمْ أُخْبَرْ أَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّيْلَ فَقُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَأَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا(۲)

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب التَّرْغِيبِ فِي النِّكَاحِ و صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب اسْتِحْبَابِ النِّكَاحِ لِمَنْ تَاقَتْ نَفْسُهُ إِلَيْهِ وَوَجَدَ مُؤْنَهُ...، عَنْ انسِ بنِ مالكٍ رضی اللہ عنہ

(۲) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب حَقِّ الْجِسْمِ فِي الصَّوْمِ

"اے عبداللہ! کیا مجھے خبر نہیں کی گئی کہ تم دن بھر روزے سے رہتے ہو اور رات بھر نفل نماز پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں اے اللہ کے رسول ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ (نفلی) روزہ رکھا کرو اور چھوڑا بھی کرو اور رات میں نماز پڑھو اور سویا بھی کرو۔ پس بے شک تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور بے شک تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور بے شک تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور بے شک تم سے ملنے آنے والے کا بھی تم پر حق ہے"۔

- بدعت کی نفی اور سنت کے احیا کا کام ہمارے ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور اِس حوالے سے ہمیں کسی مداہنت یا مصلحت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ارشاداتِ نبوی ﷺ ہیں:

مَا مِنْ نَّبِيٍّ بَعَثَهُ اللهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ أُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَ اَصْحَابٌ يَّأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَ يَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَّقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَ يَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَ لَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ (۱)

"اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی علیہ السلام نہیں بھیجا مگر یہ کہ اُس کے کچھ حواری اور صحابی ہوتے تھے جو اُس نبی علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اُس کے احکامات کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن کے بعد اُن کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جو کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں اور کرتے وہ ہیں جس کا حکم ہی نہیں دیا گیا۔ تو جو کوئی اُن سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن شمار ہو گا اور جو کوئی اُن سے زبان سے جہاد کرے گا وہ مومن شمار ہو گا اور جو کوئی اُن سے دل سے جہاد کرے گا وہ مومن شمار ہو گا اور اِس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں"۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بَيَانِ كَوْنِ النَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ مِنَ الْإِيمَانِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ

إِنَّ الدِّيْنَ بَدَأَ غَرِيْبًا وَ يَرْجِعُ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَآءِ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِيْ مِنْ سُنَّتِيْ(۱)

"یہ دین ایک اجنبی صورت میں شروع ہوا اور یہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسے شروع ہوا تھا تو اِن اجنبی پردیسیوں کے لیے خوشخبری ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو اِس بگاڑ کی اصلاح کریں گے جو میرے بعد لوگوں نے میری سنت میں پیدا کر دیا ہو گا"۔

- دراصل یہ شیطان ہے جو بندوں کو محض کونوں کھدروں، خانقاہوں اور آبادیوں سے دور غاروں میں بٹھا کر عبادات اور ریاضتوں کی راہ سجھاتا ہے تاکہ معاشرے میں ظلم و ستم کرنے والوں کو کھلی چھوٹ مل جائے اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے لوٹ کھسوٹ جاری رکھیں۔ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے۔ وہ ایک ہی ہتھیار سے سب کو شکار نہیں کرتا۔ اول تو وہ سیدھی راہ کی طرف آنے ہی سے روکتا ہے۔ اگر کوئی شخص شیطانی حملوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ایمان اور عملِ صالح کی منزلیں طے کر رہا ہے، تو شیطان اُس کی توجہ آخری منزل یعنی اِقامتِ دین کی جدوجہد سے ہٹا کر محض تزکیۂ نفس کے خانقاہی تصور کی طرف پھیر دیتا ہے۔ بس اپنی ہی ذات کو رگڑے جاؤ، اِسی کو مانجھے جاؤ اور اِسی کو سنوارے جاؤ۔ لگے رہو نمازوں میں، روزانہ روزے رکھنے میں، مشغول رہو پوری پوری رات عبادات میں لیکن میرے مقابلے میں نہ آؤ، میرے نظام کو چیلنج نہ کرو، استحصالی و استبدادی نظام کے لیے خطرہ نہ بنو۔ ذاتی نیکی کے اعتبار سے انتہائی پارسا شخص کا ذکر ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا:

أَوْحَى اللهُ عَزَّوَجَلَّ إِلٰى جِبْرِيْلَ أَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِأَهْلِهَا فَقَالَ يَا رَبِّ إِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ قَالَ فَقَالَ اقْلِبْهَا عَلَيْهِمْ فَإِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ(۲)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی (اور حکم

(۱) سنن الترمذی، کتاب الایمان، باب مَا جَاءَ أَنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ غَرِيبًا، عَنْ عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ

(۲) شعب الایمان، کتاب التاسع والثلاثون من شعب الإیمان، باب أحادیث فی وجوب الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر، عَنْ جابر رضی اللہ عنہ

دیا) کہ فلاں شہر کو مع اُس کے باشندوں کے اُلٹ دو۔ جبرائیل علیہ السلام نے عرض کی: اے پروردگار! اُن لوگوں میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے دوران (یعنی ایک لمحہ) بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُس شہر کو دیگر باشندوں کے ساتھ اُس پر بھی الٹ دو، کیوں کہ (شہر والوں کے کرتوتوں پر) میری خاطر اُس کا چہرہ ایک گھڑی بھی متغیر نہیں ہوا"۔

غور کیجیے ایک شخص یہاں تک آگیا کہ اُس نے اللہ کو پہچان لیا اور طے بھی کر لیا کہ مجھے اللہ ہی کی رضا حاصل کرنی ہے۔ گویا اُس کا نصب العین بھی درست ہو گیا۔ پھر یہ کہ اپنے نفس کی شرارتوں پر بھی قابو پالیا۔ اب آخرت کی تیاری کے لیے گناہوں سے بچ رہا ہے، حرام خوری سے اجتناب کر رہا ہے اور فواحش و منکرات سے بالکل دور ہے۔ انتہا یہ ہے کہ پلک جھپکنے میں بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کر رہا، لیکن آخری مرحلے پر شیطان جو داؤ اور اڑنگا لگاتا ہے وہ یہ ہے کہ اب اُس کا رخ موڑ دیتا ہے صرف اپنی ذاتی اصلاح ہی کی طرف تاکہ وہ کہیں نظام کی اصلاح کے لیے میدان میں نہ آجائے اور اُس کی نیکی کہیں بدی کے لیے چیلنج نہ بن جائے۔ اِس over emphasis on self purification کی نفی قرآنِ حکیم میں اِس طرح آئی:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا

(النساء 4:31)

"اگر تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے اجتناب کرو گے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مکانوں میں داخل کریں گے"۔

اللہ کے محبوب بندوں کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ اُن کی توجہ بڑے بڑے گناہوں سے بچنے یعنی فرائض ادا کرنے اور حرام سے پرہیز کرنے پر ہوتی ہے۔ اپنے کردار میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہات کو زیادہ مرکوز کرنے سے صورت وہ پیدا ہوتی ہے کہ مچھر چھانے جاتے ہیں لیکن سالم اونٹ نگل لیے جاتے ہیں۔ کمائی حرام کی ہے لیکن کھانا کھاتے وقت مسنون طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ

(النجم 53:32)

"جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں سوائے کچھ آلودگیوں کے۔ بے شک اے نبی ﷺ آپ کا رب بڑی بخشش والا ہے"۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ (الشوریٰ 42:37)

"اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں"۔

علامہ اقبال اپنی معرکۃ الآراء نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں پیغام دیتے ہیں کہ ابلیسی نظام کو اصل خطرہ مسلمانوں سے ہے کہ کہیں وہ بیدار ہو کر پھر سے اسلام کے عادلانہ نظام کو غالب کرنے کے لیے سرگرم نہ ہو جائیں۔ ابلیس کہتا ہے:

ہر نفس ڈرتا ہوں اِس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

ابلیس اپنے خطرات کے سدباب کے لیے مسلمانوں کا یہ علاج تجویز کرتا ہے کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے!

نبی اکرم ﷺ نے اِس کے برعکس امت مسلمہ کو میدان میں نکل کر باطل کے خلاف مال و جان سے جہاد کرنے کی تلقین فرمائی۔ مسندِ احمد میں آپ ﷺ کا ارشاد نقل ہوا:

لِكُلِّ نَبِيٍّ رَهْبَانِيَّةٌ وَرَهْبَانِيَّةُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ[1]

"ہر نبی کے لیے رھبانیت ہے اور اِس امت کی رہبانیت ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا"۔

بقول اقبال:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

---

(1) مسند احمد، کتاب مُسْنَدِ الْمُكْثِرِيْنَ، باب مُسْنَدُ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ

اسلام کی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں ہماری توجہ ظلم کے خاتمے اور باطل کے استیصال کی طرف رہے۔ ہم ایک انقلابی عمل میں مصروف رہ کر باطل کے ساتھ اُس وقت تک پنجہ آزمائی کرتے رہیں جب تک دینِ حق غالب نہ ہو جائے۔ انقلابی عمل کے دوران بھی تکالیف اور مصائب آئیں گی، فاقوں کی نوبت آئے گی، پیٹ پر پتھر بھی باندھنے پڑیں گے، راتوں کو سونا نصیب نہیں ہو گا۔ مختصراً یہ کہ وہ ساری مشکلات اور مصائب جو خواہ مخواہ ایک تکلف و تصنع کی شکل میں نظامِ رہبانیت میں انسان اپنے اوپر طاری کرتا ہے، سب کے سب آئیں گی، لیکن اب وہ کار آمد (productive) ہوں گی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کی مشقتوں کے نتیجے میں معاشرے میں عدل قائم ہو گا اور لوگوں کو سکون میسر آئے گا۔ رہبانیت کا نظام تو در حقیقت ایک اعتبار سے ظلم اور شر کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نیک لوگ میدان سے ہٹ جاتے ہیں اور معاشرے میں ظالموں اور شریروں کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ اب اُنہیں کوئی چیلنج کرنے والا نہیں ہوتا اور وہ لوٹ کھسوٹ کی آخری حد کو پہنچ جاتے ہیں۔

آیت 28:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا... اے لوگو جو ایمان لائے ہو!... اتَّقُوا اللّٰهَ ... اللہ کی نافرمانی سے بچو... وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ... اور ایمان لاؤ اُس کے رسول پر... يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ... وہ دے گا تمہیں دوحصے اپنی رحمت سے... وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ... اور دے گا تمہیں وہ نور جس کے ساتھ تم چل سکو گے... وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ... اور تمہیں بخش دے گا... وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

- اِس آیت میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے مخاطب دو گروہ ہیں۔ سورت کا اختتامی حصہ ہونے کے اعتبار سے اور پوری سورت کے مضامین کی مناسبت سے خطاب کا رُخ مسلمانوں کی طرف ہے اور پچھلی آیت کے ساتھ ربطِ مضمون کے اعتبار سے خطاب کا رُخ عیسائیوں کی طرف ہے جو نبی اکرم ﷺ سے پہلے مبعوث ہونے والے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھتے تھے۔ اِس آیت میں دونوں مخاطبین کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ تقویٰ کے لغوی معنی ہیں بچنا۔ اصطلاحی طور پر تقویٰ کا مفہوم ہے اللہ کی نافرمانی یا اللہ کی ناراضگی سے بچنا۔ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے سورۂ بقرۃ

کی تفسیر کے آغاز میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں تقویٰ کی بڑی عمدہ وضاحت نقل کی ہے:

سَأَلَ عُمَرُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ عَنِ التَّقْوٰى، فَقَالَ لَهُ أَمَا سَلَكْتَ طَرِيقًا ذَا شَوْكٍ؟ قَالَ بَلٰى، قَالَ فَمَا عَمِلْتَ؟ قَالَ شَمَّرْتُ وَاجْتَهَدْتُ، قَالَ فَذٰلِكَ التَّقْوٰى

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے تقویٰ کیا ہے؟ تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا کبھی آپ ایسے کسی راستہ سے گزرے ہیں جو کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا جی ہاں۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ پھر آپ کیا کرتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اپنا لباس سمیٹتا ہوں اور جسم کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہی تقویٰ ہے"۔

گویا تقویٰ ترکِ دنیا کی نفی ہے۔ تقویٰ اصل میں یہ ہے کہ دنیا میں بھرپور زندگی بسر کرنا، نکاح بھی کرنا اور اپنی گزر اوقات کے لیے معاشی بھاگ دوڑ بھی کرنا لیکن شیطانی حملوں سے خود کو بچاتے ہوئے دامنِ کردار کو گناہوں اور نافرمانیوں سے پاک رکھنا، بقولِ شاعر:

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

تقویٰ دراصل ایک باطنی کیفیت کا نام ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار اپنے قلبِ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا"(1) یعنی تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ تقوے کی وجہ سے انسان پر ہر وقت خدا خوفی اور اُخروی جواب دہی کا احساس طاری رہتا ہے، لہٰذا وہ اللہ کی نافرمانی سے بچتا ہے۔ انسان کو اللہ کی بارگاہ میں عزت تقویٰ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے نہ کہ رہبانیت اختیار کرنے سے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ (الحجرات 49:13)

"اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے"۔

(1) صحیح مسلم، کتاب البِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، باب تَحْرِيمِ ظُلْمِ الْمُسْلِمِ، وَخَذْلِهِ، وَاحْتِقَارِهِ....، عَنْ ابی هريرة رضی اللہ عنہ

- اِس آیت میں مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ تم نے سن لیا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا شان ہے اور اُس کی کیا صفات ہیں۔ تم پر دین کے تقاضے بھی واضح ہو گئے، اِن تقاضوں کو ادا کرنے والوں کا حسین انجام بھی بیان کر دیا گیا اور تقاضوں کی ادائیگی سے گریز کی صورت میں برے انجام کی وعید سے بھی تمہیں خبر دار کر دیا گیا۔ دنیا کی زندگی کے فریب کا پردہ بھی تم پر چاک کر دیا گیا اور اِس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات کی حقیقت سے بھی تمہیں آگاہ کر دیا گیا۔ تمہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ کے دین کی نصرت وہ اعلیٰ ترین عمل ہے جس سے انسان کو اللہ اور اُس کے رسولوں کا مددگار بننے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ اِس اعلیٰ عمل سے محروم کرنے کے لیے ترکِ دنیا کے شیطانی فریب کو بھی تم پر کھول دیا گیا۔ اب تم پر حجت پوری ہو گئی۔ اب خیر اِسی میں ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور دین کے تقاضے ادا کرو۔ دوسری طرف عیسائیوں سے کہا جارہا ہے کہ تم اِس سے پہلے تمام انبیاء پر ایمان رکھنے کی سعادت سے بہرہ ور ہو۔ اب آخری رسول تشریف لا چکے ہیں، اِن پر بھی ایمان لے آؤ اور اِس حوالے سے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ہمیشہ ہمیش کی سعادتوں سے محروم نہ ہو جاؤ۔

- وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ کے الفاظ مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ پر اِس طرح ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ تمہیں "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" یعنی زبانی اقرار کی بنیاد پر قانونی ایمان تو حاصل ہے لیکن اب "تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ" یعنی یقینِ قلبی کے حصول کی کوشش کر کے ایمانِ حقیقی سے باطن کو منور کرو۔ یہ وہی انداز ہے جو سورۃ النساء[4] کی آیت 136 میں آیا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ

"اے اہل ایمان! ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر"۔

اِس آیت میں ایمان بالرسالت پر زور اِس لیے دیا گیا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کے لیے ایک کامل اور متوازن نمونہ (model) صرف اور صرف نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ بابرکت میں ہے۔ دیگر جذبات کی طرح نیکی کا جذبہ بھی اندھا ہوتا ہے اور بعض اوقات بڑھ کر رہبانیت کی

صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اِسے حدود میں رکھنے کے لیے متوازن رہنمائی اللہ کے رسول ﷺ کے طرزِ عمل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب 33:21)

"یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں بہترین نمونہ ہے"۔

یہ وہ اسوۂ حسنہ ہے جس میں نہ دنیا پرستی ہے اور نہ ترکِ دنیا، اللہ کی قربت کے حصول کے لیے نفسانی خواہشات پر گرفت (control) بھی ہے لیکن فطری جذبات کی تسکین کا سامان بھی، تزکیۂ نفس کے لیے مشقتیں بھی ہیں لیکن نہ غیر فطری ریاضتیں ہیں اور نہ تپسیائیں۔ البتہ آپ ﷺ کے اُسوہ سے صحیح رُخ پر استفادہ کے لیے دو باتیں اہم ہیں۔ پہلی یہ کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انفرادی و اجتماعی دونوں گوشوں سے متعلق سنت کے جو پہلو ہیں، اِن سب پر عمل کی کوشش کی جائے۔ دوسرے یہ کہ سنت کے تمام اجزاء کے مابین نسبت و تناسب وہی قائم رہے جو رسول اللہ ﷺ کے معمولات میں تھا۔ اگر وہاں کوئی عمل تولہ ہے تو اپنے معمولات میں بھی اُسے تولہ ہی رکھا جائے۔ اگر اِسے سیر کر دیا تو سیرت پر عمل کی صورت ہی بدل جائے گی۔ ہم بعض فروعی اور اختلافی نوعیت کی سنتوں پر تو بہت حساس ہو جاتے ہیں لیکن آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں نمایاں ترین اور مسلسل نظر آنے والی سنتوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ کی سب کی بڑی اور مؤکد ترین سنت دعوت و تبلیغ ہے جس کا ہدف اقامتِ دین تھا یعنی اللہ کے دین کو غالب کرنا۔ ظہورِ نبوت کے بعد آپ ﷺ نے کسی غار یا خانقاہ میں بیٹھ کر چلہ کشی، مراقبے یا ریاضتیں نہیں کیں بلکہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو غفلت کے اندھیروں سے نکالا، منظم کیا اور باطل سے ٹکرا کر حق کا بول بالا کر دیا۔ دنیا میں لوگوں کو ایک عادلانہ نظام کی چھتری تلے سکون ملا اور آخرت کی تیاری کے لیے بھی ایک ساز گار فضا فراہم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی آپ ﷺ کے مبارک اُسوے کی پیروی کی توفیق مرحمت فرمائے۔ اللہ کی رضا اور محبت رہبانیت سے نہیں آپ ﷺ کی پیروی سے ملے گی:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران 3:31)

"(اے نبی) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو (محبت کے ساتھ) میری

پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

- آیت کے اگلے حصے میں فرمایا جو بھی نبی اکرم ﷺ پر ایمان لائے گا اور آپ ﷺ کی پیروی کرے گا، اُسے اللہ کی رحمت کے دو حصے ملیں گے۔ ایک اپنی انفرادی نیکی کا اور دوسرا دعوت و تبلیغ کی سنت پر عمل کر کے لوگوں کو حق کی راہ کی طرف لانے کا۔ حدیثِ مبارکہ ہے:

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا كَانَ لَهُ أَجْرُهَا، وَمِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا[1]

"جس نے کسی بھلائی کو جاری کیا پھر اُس پر عمل کیا تو اُس کے لیے اجر ہے اور اُس کا اجر بھی ہے جس نے اِس بھلائی پر عمل کیا، بغیر عمل کرنے والے کے اجر میں کمی کیے ہوئے"۔

عیسائیوں سے خطاب کے حوالے سے اُنہیں خوشخبری دی جا رہی ہے کہ اگر وہ اللہ کے آخری رسول ﷺ پر بھی ایمان لے آئیں گے تو اُن کے لیے رحمت کے دو حصے یعنی دوہرا اجر ہو گا۔ اِس بشارت کا ذکر آیا ہے سورۃ القصص 28 کی آیات 52 تا 54 میں:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾

"جن لوگوں کو ہم نے اِس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اِس پر ایمان لا رہے ہیں۔ اور جب (قرآن) اُن کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اِس پر ایمان لائے بیشک وہ ہمارے رب کی طرف سے برحق ہے (اور) ہم تو اِس سے پہلے بھی مسلمان تھے (یعنی تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھتے تھے)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اُن کو دگنا بدلا دیا جائے گا کیونکہ اُنہوں نے صبر کیا اور برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہیں اور جو (مال) ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے ایک ارشادِ مبارک میں

---

(۱) سنن ابن ماجة، افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، باب مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً، عَنْ جرير رضی اللہ عنہ

اسلام قبول کرنے والے اہلِ کتاب کو دوہرے اجر کی خوشخبری دی ہے:

ثَلَاثَةٌ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآدْرَكَ النَّبِيَّ ﷺ فَآمَنَ بِهِ وَاتَّبَعَهُ وَصَدَّقَهُ، فَلَهُ أَجْرَانِ، وَعَبْدٌ مَمْلُوكٌ أَدَّى حَقَّ اللهِ تَعَالَى وَحَقَّ سَيِّدِهِ، فَلَهُ أَجْرَانِ، وَرَجُلٌ كَانَتْ لَهُ أَمَةٌ فَغَذَّاهَا فَأَحْسَنَ غِذَائَهَا ثُمَّ أَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ أَدَبَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا، فَلَهُ أَجْرَانِ(۱)

"تین قسم کے لوگ وہ ہوں گے جنہیں (روزِ قیامت) دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اہلِ کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا اور اُس نے پایا نبی اکرم ﷺ کا زمانہ (جو اب قیامت تک کے لیے ہے) تو وہ آپ ﷺ پر ایمان لے آیا اور آپ ﷺ کی پیروی کی اور آپ ﷺ کی تصدیق کی تو اُس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ دوسرا وہ غلام جس نے حق ادا کیا اللہ تعالیٰ کا اور اپنے آقا کا بھی تو اُس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کی کوئی کنیز تھی تو اُس نے اُسے اچھی غذا دی (یعنی عمدہ پرورش کی)، پھر اُس کی اچھی تربیت کی، پھر اُسے آزاد کر دیا اور اُس سے نکاح کر لیا تو اُس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے"۔

- اِس آیت میں دوسری نوید یہ سنائی گئی کہ اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان اور اُن کی پیروی اختیار کرنے کی صورت میں اللہ تمہیں وہ نور عطا فرمائے گا جس کی مدد سے تم چل سکو گے۔ اِس بشارت کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ ایمان سے وہ بصیرتِ باطنی حاصل ہو گی جو انسان کو صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے درکار ہے۔ سنت نبوی ﷺ وہ نور ہے جو زندگی کے ہر ہر معاملے میں کامل، معتدل اور متوازن رہنمائی عطا فرماتا ہے۔ خاص طور پر انقلابی جدوجہد کے دوران درپیش آنے والے مراحل کے لیے رہنمائی صرف اور صرف آپ ﷺ ہی کی سیرت سے ملے گی کیونکہ تاریخِ نبوت و رسالت میں آپ ﷺ ہی وہ واحد نبی ہیں جن کے ذریعے ایک انقلابی عمل ابتدا سے آخر تک پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ آخرت کے اعتبار سے یہ وہ نور ہو گا جس کا ذکر اِسی سورت کی آیت 12 میں آچکا ہے۔ وہ نور جس کے ذریعے روزِ قیامت پل صراط کا کٹھن مرحلہ طے کر کے جنت کی لازوال نعمتوں تک رسائی حاصل ہو سکے گی۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وُجُوبِ الْإِيمَانِ بِرِسَالَةِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ ﷺ، عَنْ ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ

- آیت کے بالکل آخر میں تیسری بشارت دی گئی کہ اللہ اُن لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دے گا جو اللہ کے رسول پر ایمان لا کر آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا۔ یہ خوشخبری مسلمانوں کے لیے بھی ہے اور بالخصوص اُن عیسائیوں کے لیے بھی جو آپ ﷺ کی تعلیمات پر ایمان لے آئیں کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے اُن کے قبولِ اسلام کے وقت فرمایا:

اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْاِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ وَاَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا؟ وَاَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟[1]

"کیا تم جانتے نہیں ہو کہ بے شک اِسلام قبول کرنا پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے؟ اور بے شک ہجرت کا عمل پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے؟ اور بے شک حج کی عبادت پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے؟"

آیت 29:

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ ... تاکہ اہلِ کتاب جان لیں ... اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ ... کہ وہ اختیار نہیں رکھتے کچھ بھی اللہ کے فضل پر ... وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ... اور بے شک فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ... يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ... وہ دیتا ہے اِسے جسے وہ چاہے ... وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

- سورۂ حدید کی اِس آخری آیت میں اہلِ کتاب کے لیے دلجوئی اور امید دلانے کا اُسلوب ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد اہلِ کتاب کو اُن کے بعض جرائم کی وجہ سے امت کے منصب اور دنیا میں اللہ کی نمائندگی کی سعادت سے محروم کر دیا گیا اور اُن کی جگہ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے والوں کو یہ اعزاز بخشا گیا۔ سورۃ البقرۃ[2] میں یہ مضمون بڑی تفصیل سے آیا ہے اور آیت 143 میں امت محمدیہ ﷺ کو امامت کے منصب پر فائز کرنے کا اعلان اِس طرح کیا گیا:

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب کَوْنِ الْإِسْلَامِ يَهْدِمُ مَا قَبْلَهُ وَكَذَا الْهِجْرَةَ وَالْحَجَّ، عَنْ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

"اور اِسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امّت بنایا کہ تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر اور رسول ﷺ گواہ بن جائیں تم پر"۔

- سورۂ حدید کی اِس آیت میں اہلِ کتاب کو امید دلائی گئی کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ کو تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم اللہ کے آخری رسول ﷺ پر ایمان لا کر اور اُن کی پیروی کر کے پھر سے امت کے منصب میں شریک ہو سکتے ہو اور اللہ کا فضل حاصل کر سکتے ہو۔

سورۃ المائدۃ[5] آیات 65 اور 66 میں یہ مضمون اِس طرح بیان ہوا:

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ

"اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے تو ہم اُن سے اُن کی خطائیں دور کر دیتے اور اُن کو ضرور نعمت کے باغوں میں داخل کرتے۔ اور اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو اور جو (اور کتابیں) اُن کے رب کی طرف سے اُن پر نازل ہوئیں تو وہ کھاتے (اللہ کی نعمتیں) اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے"۔

- اللہ کا فضل اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور اُس پر کسی اور کی اجارہ داری نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اپنے آپ کو حسنِ نیت اور پاکیزہ کردار سے فضل کا حق دار ثابت کرو، اللہ ضرور فضل سے نوازے گا، وہ بڑے فضل والا ہے۔ اُس کے فضل کو ہم اپنے حساب کتاب سے نہیں تول سکتے، نہیں ناپ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل سے وافر حصہ عطا فرمائے، دین کا فہم دے، دین کے تقاضوں کا شعور بخشے اور اِن تقاضوں کو عملاً ادا کرنے کا عزم کر لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین